

امت کی رہبری

تالیف آیۃ اللہ جعفر سبحانی



بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

”شروع کرتا ہوں اللہ کے نام سے جو بڑا رحم کرنے والا اور مہربان ہے“

خانہ فرهنگ جمهوری اسلامی ایران - کراچی

شمارہ دیوبی: ۲۰۶۷ /
شمارہ ثبت: ۱۵۱۶۵
تاریخ ثبت: ۱۱ / ۱۱ / ۷۳
۱۳۸۷

امت کی رہبری

آیۃ اللہ جعفر سبحانی

مترجم: سید احتشام عباس زیدی

مجمع جهانی اہل بیت علیہم السلام



نام کتاب: امت کی رہبری
مؤلف: آیۃ اللہ جعفر سبحانی
مترجم: سید اقصیٰ عباس زیدی
پیشکش: معاونت فرہنگی، ادارہ ترجمہ
ناشر: مرکز چھاپ و نشر مجمع جهانی اہل بیت (ع)
طبع اول: ۱۴۲۷ھ ۲۰۰۶ء
تعداد: ۳۰۰۰
مطبع: لیبلی

ISBN: 964-8686-87-4
www.ahl-ul-bayt.org
Info@ahl-ul-bayt.org

فہرست

۱۳-۱۱.....عرض ناشر

۱۸-۱۳.....مقدمہ

اس کتاب کی تحریر کا مقصد
اسلامی معارف و احکام میں قیادت

۲۵-۱۹.....پہلی فصل

امام کی شناخت کا فلسفہ

۳۱-۲۶.....دوسری فصل

امامت کے سلسلہ میں دو نظریے
الف۔ علمائے اہل سنت کا نظریہ
ب۔ شیعہ علماء کا نظریہ

۳۹-۳۳.....تیسری فصل

شیعہ نظریہ کی صحت کی دلیلیں
پیش آنے والے نئے مسائل
تکمیل دین کی دوسری نوعیت
خلفائے امت کی لاعلمی

۴۰-۴۳..... چوتھی فصل

پیغمبرِ امامت کو الہی منصب سمجھتے ہیں
نبوت و امامت باہم ہیں

۴۵-۵۲..... پانچویں فصل

اسلامی قوانین اور کتابِ خدا
قرآن کی تفسیر میں اختلاف
ہشام ابن حکم

۵۳-۵۷..... چھٹی فصل

خطرناک مثلث، اسلام کے تین دشمن
پہلا دشمن
باقی دو دشمن

۵۸-۶۱..... ساتویں فصل

روحی و معنوی کمال امام معصوم کے سایہ میں

۶۲-۷۳..... آٹھویں فصل

کیا شیعوں کا نظریہ امامت آزادی کے خلاف ہے
الف۔ امام کا منصوب کیا جانا استبداد نہیں
ب۔ جمہوری حکومتوں کی کمزوریاں
ج۔ کیا صدر اسلام میں خلیفہ کا انتخاب اکثریت نے کیا؟

۷۴-۸۰..... نویں فصل

اسلام میں مشورہ

۸۱-۸۷..... دسویں فصل

یک طرفہ فیصلہ نہ کریں

گیارہویں فصل ۹۸-۸۸

سقیفہ بنی ساعدہ کی غم انگیز داستان
اہل سقیفہ کی منطق
تاریخی المیہ

بارہویں فصل ۱۰۷-۹۹

انصار و مہاجرین کی منطق کیا تھی
اصحاب سقیفہ کی منطق پر امیر المؤمنین کا تجزیہ
امیر المؤمنین کی خلافت کیلئے خود شائستہ ہونے کی منطق

تیرہویں فصل ۱۱۳-۱۰۸

نماز کی امامت، خلافت کیلئے دلیل نہیں
نماز میں حضرت ابو بکر کی جانشینی

چودھویں فصل ۱۲۶-۱۱۵

حکمرانی، معنوی رہبری سے جدا نہیں ہے
بیان احکام اور لوگوں کی رہنمائی
دو منصب کو ایک دوسرے سے جدا کرنا صحیح نہیں
عیسائی تفکر

پندرہویں فصل ۱۳۶-۱۲۷

اسلامی احکام سے خلفاء کی نا آگاہی
خلیفہ اول کی لاعلمی کے چند نمونے
خلیفہ دوم کی معلومات کا معیار
خلیفہ سوم کے معلومات کا معیار

۱۳۷-۱۳۹

سولہویں فصل

پیغمبرؐ کے صحابی، گناہ و خطا سے معصوم نہیں
 حق و باطل پہچاننے کا راستہ
 اس سیاہ فہرست کے چند نمونے

۱۵۰-۱۶۰

سترہویں فصل

حضرت علیؑ کی پیشوائی کے بارے میں نقلی دلائل
 ۱- حدیث منزلت

۱۶۱-۱۷۱

اٹھارہویں فصل

حدیث غدیر (پہلا حصہ)
 ۱- تہمت کا حربہ
 ۲- آپ کے پیروں کو آزار پہنچانا
 ۳- عرب کے بڑے داستان گو کو دعوت
 ۴- قرآن مجید سننے پر پابندی
 ۵- اقتصادی پابندی
 ۶- پیغمبر اکرمؐ کو قتل کرنے کی سازش
 ۷- خونین جنگیں
 ۸- پیغمبر اسلامؐ کی وفات

۱۷۲-۱۷۹

انیسویں فصل

حدیث غدیر (دوسرا حصہ)
 غدیر کا تاریخی واقعہ ایک ابدی حقیقت
 غدیر کا واقعہ لافانی و جاہدانی ہے
 واقعہ کی ابدیت اور لافانی کے دیگر دلائل

۱۸۸-۱۸۰..... بیسویں فصل

حدیث غدیر (تیسرا حصہ)
غدیر کے باشکوہ اجتماع کا مقصد کیا تھا؟

۱۹۹-۱۸۹..... اکیسویں فصل

دو سوالوں کے جواب

دو سوال

پہلے سوال کا جواب

دوسرے سوال کا جواب

۲۰۷-۲۰۰..... بائیسویں فصل

حدیث ”ثقلین“ اور حدیث ”سقیۃ“

قرآن و عترت کا باجم الٹوٹ رشتہ

حدیث ثقلین کا مفاد

امیر المؤمنین کا حدیث ثقلین سے استدلال

ایک نکتہ کی یاد دہانی

عترت پیغمبر سقیۃ نوح کے مانند

حدیث سقیۃ کا مفاد

۲۱۳-۲۰۸..... تیسویں فصل

ایک شخص کا معصوم ہونا کیسے ممکن ہے؟

عصمت کیا ہے؟

۲۱۹-۲۱۳..... چوبیسویں فصل

رہبران الہی کے لئے عصمت کی دلیلیں

تربیت عمل کے سایہ میں

اعتماد جذب کرنا

۲۴۰-۲۴۳..... چھبیسویں فصل

جن کے رتبے ہیں سوالان کو سوا...

قرآن کی رہنمائی

ایک سوال کا جواب

قرآن کی دوسری رہنمائی

۲۴۵-۲۴۸..... چھبیسویں فصل

کون سی تعبیر صحیح ہے ”عترتی“ یا ”سنٹی“

۱۔ کون سی تعبیر صحیح ہے؟

وضاحت

سوال

جواب

”سنٹی“ کے متن کی سند

پہلی سند، حاکم کی روایت

”سنٹی“ کی دوسری سند

حدیث ”سنٹی“ کی تیسری سند

بغیر سند کی روایت

۲۔ پیغمبرؐ پر صلوات کیسے بھیجیں

شعری ترجمہ

عرض ناشر

عالم اسلام کی موجودہ صورت حال، مسلمان حکومتوں اور ملکوں کا باہم متحد نہ ہونا اسلامی اخوت و مساوات کا فقدان، اسلام اور اسلامی تعلیمات کے بجائے غیر اسلامی تعلیمات کی طرف رجحان اور الہی طاقت و قوت پر اعتماد کے بجائے ان کا غیر الہی اور کھوکھلی طاقتوں پر ایمان۔ نتیجہ میں استعماری طاقتوں اور عالمی صہیونزم کا ان پر تسلط مسلمانوں کا بے مہابا قتل عام اور ان کے طبعی و زمینی ذخائر کی اندھا دھند لوٹ کھسوٹ اور ساتھ ہی کلمہ لا الہ الا اللہ پڑھنے والوں کی بے بسی و یکسی ایک صائب اور صحیح فکر رکھنے والے مسلمان کو بہت کچھ سوچنے پر مجبور کرتی ہے۔

ہم چودہ سو سال سے آج تک متفرق کیوں ہیں۔ مسلمانوں کے درمیان، صدیوں سے اس فرقہ واریت کے اسباب کیا ہیں، مسلمانوں میں کلام الہی کی یہ عملی تصویر کیوں نظر نہیں آتی جس میں وہ ارشاد فرماتا ہے ﴿ اذ کنتم اعداء فالف بین قلوبکم فاصبحتم بنعمتہ اخوانا ﴾ بلکہ مسلمان خود ایک دوسرے کے جانی دشمن کیوں بنے ہوئے ہیں کیا ہم عملاً کہہ سکتے ہیں کہ اسلامی تعلیمات عالم انسانیت کی فلاح کیلئے بہترین تعلیمات ہیں۔ قرآن کے آئیڈیل مسلمان جو ﴿ اشداء علی الکفار رحماء بینہم ﴾ کی عملی تصویر ہیں پوری اسلامی تاریخ میں انگلیوں پر گننے کے قابل کیوں ہیں۔

اس کا صاف جواب یہ ہے کہ ہمارے پاس آنحضرتؐ کی رحلت کے بعد سے کوئی عملی قرآنی لیڈر شپ نہیں رہی مسلمانوں نے ابتداء ہی سے پیغمبر اکرمؐ کی رحلت کے بعد نہ قرآنی تعلیمات پر سنجیدگی سے عمل کیا اور نہ پیغمبر اکرمؐ کے ارشادات پر کان دھرے اور خدا پسند مسلمان بننے کے بجائے خود پسند مسلمان بنے۔ قرآن کریم کے معلم اول حضرت محمدؐ اپنے بعد قرآن

کے جن معلموں کو ”حدیث ثقلین“ کی روشنی میں ہمارے درمیان چھوڑ گئے تھے مسلمانوں نے ان کے ساتھ جو سلوک کیا وہ تاریخ میں محفوظ ہے اور باہوش مسلمانوں سے پوشیدہ نہیں لہذا ان حالات کی روشنی میں آج بھی یہ بحث تازہ اور گرما گرم ہے کہ پیغمبر اکرم ﷺ جو خدا کی جانب سے بھیجے گئے تھے اور الہی تعلیمات اور قرآنی دستور العمل ہماری حیات کیلئے لئے آئے تھے۔ ان کی رحلت کے بعد کیا مسلمان تمام الہی تعلیمات اور قرآنی دستور حیات سے اتنے آگاہ ہو چکے تھے کہ انہیں پھر کسی الہی معلم قرآن کی ضرورت نہیں رہ گئی تھی اور وہ اپنی مرضی سے الہی نظام حیات کو چلا سکتے تھے؟ دوسرے لفظوں میں کیا وہ خدا سے زیادہ اپنے حالات و معاملات سے آگاہ ہو گئے تھے؟

یا ”عدول“ کا لقب پانے والے آنحضرتؐ کے اصحاب نے خدا، قرآن اور پیغمبر اکرم ﷺ کے دستورات کے خلاف خدا و رسول کی مرضی کے بجائے اپنی مرضی کو عملی جامہ پہنایا اور ”امت کی رہبری“ اپنے ہاتھوں میں لے لی۔ انجام کار سامنے ہے کہ مسلمان آج چودہ سو برسوں سے ترقی کے بجائے زوال کی طرف مائل ہیں اور خدا کی جانب سے ”مغضوب“ اور ”ضالین“ شمار کی جانے والی قومیں ان پر غالب ہیں۔

یہ کتاب ”امت کی رہبری“ جو آپ کے ہاتھوں میں ہے اسی موضوع پر آیۃ اللہ شیخ جعفر سبحانی مدظلہ کی ایک بہترین کاوش ہے جسے موجودہ افکار و خیالات کی روشنی میں نئے رخ سے پیش کیا گیا ہے امید ہے کہ خداوند عالم اس کے ذریعہ حق کے جو یا افراد کی ہدایت فرمائے۔

آمین یا رب العالمین

ناشر

مقدمہ

اس کتاب کی تحریر کا مقصد

پیغمبر اکرم ﷺ کی رحلت کے بعد امت کی قیادت و رہبری کا مسئلہ اسلام کے ان اہم مسائل میں سے ہے جس کی تحقیق ہر طرح کے تعصب و غرض و مرض سے دور پرسکون ماحول میں کی جانی چاہئے۔

سب سے پہلا مسئلہ جو پیغمبر اسلام ﷺ کی رحلت کے بعد زبانوں پر آیا اور بحث کا موضوع بنا اور آج بھی اس پر بحث و تحقیق جاری ہے وہ پیغمبر اسلام ﷺ کی رحلت کے بعد مسلمانوں کی سیاسی و سماجی قیادت و رہبری کا مسئلہ تھا کیونکہ اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ پیغمبر اکرم ﷺ ہر جہت سے مسلمانوں کے سرپرست و رہبر تھے۔ قرآن کی متعدد آیتیں آنحضرت ﷺ کی وسیع قیادت و رہبری کی گواہی دیتی ہیں جن میں سے بعض آیتیں ہم یہاں ذکر کرتے ہیں:

۱۔ ”اطيعوا الله واطيعوا الرسول واولى الامر منكم“ ۱

اللہ، رسول اور اپنے حاکموں کی اطاعت کرو

۲۔ ”النسی اولیٰ بالمؤمنین من انفسہم“ ۱۔

پیغمبرؐ مومنوں (کی جان و مال) پر ان سے زیادہ سزاوار ہے۔

اس وسیع و عریض قیادت و رہبری کا ایک پہلو اسلامی سماج میں عدالت قائم کرنا ہے۔ پیغمبر

اسلام ﷺ مدینہ میں اپنے قیام کے دوران خود یا مدینہ سے باہر دوسروں کے ذریعہ سماج میں

عدالت برقرار کرتے تھے۔ قرآن مسلمانوں کو حکم دیتا ہے کہ اپنے معاملات اور اختلافات میں

پیغمبر اکرم ﷺ کے فیصلوں کو بے چون و چرا تسلیم کریں:

”فلا وربک لا یؤمنون حتیٰ یحکموا فیما شجر بینہم ثم لا یجدوا

فی انفسہم حرجا مما قضیت ویسلموا تسلیمًا“ ۲۔

(تمہارے پروردگار کی قسم وہ لوگ ہرگز مومن واقعی شمار نہیں ہوں گے جب تک وہ اپنے

اختلاف میں تمہیں حکم اور قاضی قرار نہ دیں اور اس پر ذرا بھی ملول نہ ہوں اور تمہارے فیصلہ پر مکمل

تسلیم ہوں)

پیغمبر اکرم ﷺ کی سماجی رہبری کا ایک پہلو اسلام کے مالی و اقتصادی امور کا ادارہ

کرنا ہے کہ آنحضرتؐ اپنی حیات میں ان کاموں کو انجام دیتے تھے۔ قرآن مجید نے ان الفاظ میں

آپؐ کو خطاب کیا ہے:

”خذ من اموالہم صدقۃ تطہرہم وتزکیہم بہا“ ۳۔

ان کے اموال میں سے زکوٰۃ لو اور اس طرح انہیں پاک کرو۔

دوسری آیات میں زکات اور ٹیکس کی مقدار اور ان کے مصارف کا بھی پوری باریکی کے

۱۔ احزاب ۶۱

۲۔ نساء ۶۵

۳۔ سورہ توبہ ۱۰۳

ساتھ ذکر کیا گیا ہے۔

ان آیات کے معانی، ان کی وضاحت کرنے والی روایات اور خود آنحضرتؐ کا طرز عمل یہ بتاتا ہے کہ آنحضرتؐ مسلمانوں کے سرپرست، سماج کے حاکم، اور ملت و امت کے فرمانروا تھے۔ اور جو سماج کا مطلق العنان حاکم انجام دیتا ہے وہ انجام دیتے تھے۔ فرق یہ تھا کہ یہ سرپرستی اور حکومت لطف الہی کی شکل میں خدا کی طرف سے آپؐ کو عطا ہوئی تھی۔ لوگوں نے آپؐ کو اس منصب کے لئے منتخب نہیں کیا تھا۔

نقطہ حساس یہ ہے کہ ہم یہ جانیں کہ پیغمبر اکرم ﷺ کی رحلت کے بعد امت کی باگدور اور سرپرستی کس کے ذمہ ہے اور اسلامی سماج کی اجتماعی و سیاسی قیادت کس کے ہاتھ میں ہونی چاہئے جو سماج کو ہرج و مرج، فساد اور پسماندگی سے محفوظ رکھے؟

اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ اسلام جیسے عالمی و جاودانی دستور میں اس امر کو فراموش نہیں کیا گیا ہے اور اس کے لئے ایک بنیادی منصوبہ پیش کیا ہے اور وہ ہے ”اولی الامر“ کی پیروی و اطاعت جو ہم پر واجب کی گئی ہے اور اس سلسلہ میں کوئی بحث نہیں ہے۔ پس یہاں جو نکتہ قابل بحث ہے یہ ہے کہ جن حکام کی اطاعت واجب کی گئی ہے مسلمان ان کی شخصیت کو پہچانیں تاکہ خوب اطاعت کریں۔

مسلمانوں کا ایک گروہ یہ کہتا ہے کہ خود پیغمبر اکرم ﷺ نے خداوند عالم کے حکم سے اسلامی سماج کے سیاسی و اجتماعی امور کو ادارہ کرنے کے لئے اپنے بعد حاکم یا حکام معین کئے ہیں۔ اس گروہ کے مقابل ایک دوسرا گروہ ہے جو یہ کہتا ہے کہ خداوند عالم نے لوگوں کو یہ اختیار دیا ہے کہ پیغمبر ﷺ کی رحلت کے بعد اپنے لئے حکام کا انتخاب کریں۔ شیعہ پہلے نظر یہ کے اور اہل سنت دوسرے نظر یہ کے طرفدار ہیں۔

اگر مسلمانوں کی امامت و پیشوائی کا مسئلہ اسی حد میں ہو کہ پیغمبر اکرم ﷺ کی رحلت کے بعد اسلام

کے اس سیاسی و اجتماعی منصب پر کون فائز ہوا، اس شخص کی تعیین کس شکل میں ہوئی پیغمبر ﷺ نے اس منصب پر کسی کو معین کیا یا کوئی شخص عوام کی جانب سے اس منصب کے لئے منتخب ہوا، تو یہ بحث صرف ایک تاریخی پہلو کی حامل ہوگی اور چودہ صدیوں کے بعد آج کی نسل کے لئے کوئی خاص سازگار اور مفید نہیں ہوگی۔ (اگرچہ ان افراد کی شناخت بھی اس عہد کے لوگوں کے لئے ضروری اور اہم شمار ہوتی تھی) لیکن اگر بحث کی شکل تبدیل ہو اور یہ کہا جائے کہ بحث کا موضوع پیغمبر اکرم ﷺ کی رحلت کے بعد اسلامی سماج کی صرف سیاسی و اجتماعی قیادت ہی نہیں ہے بلکہ پیغمبر اکرم ﷺ اس منصب کے علاوہ ”دین کے اصول و فروع میں بھی مرجعیت و رہبری کا منصب رکھتے تھے۔ تو اب سوال یہ ہے کہ پیغمبر اکرم ﷺ کی رحلت کے بعد اس پہلو کی قیادت کس کے ذمہ ہے؟ اور کیسے اشخاص کو حلال و حرام اور امر و نہی کا منصب دار ہونا چاہئے تاکہ اسلامی حقائق کے سلسلہ میں ان کے اقوال اور نظریات صبح قیامت تک انسانوں کے لئے حجت ہوں؟ اس صورت میں امام کی شناخت اور دینی امامت و پیشوائی کے سلسلہ میں بحث ہر مسلمان کی زندگی کا حصہ قرار پاتی ہے اور کوئی شخص بھی اس معرفت سے بے نیاز نہیں ہو سکتا۔ اب اس مطلب کی وضاحت پر توجہ دیں:

اسلامی معارف و احکام میں قیادت و مرجعیت:

اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ پیغمبر ﷺ کی قیادت و رہبری صرف سیاسی و سماجی امور میں نہیں تھی بلکہ آپ قرآنی آیات کے مطابق اس الہی کتاب کے معلم، قرآن کے مشکل مطالب کی تفسیر و وضاحت کرنے والے، اور الہی احکام و سنن کو بیان کرنے والے تھے۔ اس اعتبار

۱۔ ”یعلمہم الكتاب والحکمة“ (جمہر۲)

۲۔ ”و انزلنا الیک الذکر لتبین للناس ما نزل الیہم“ (نحل ۳۴)

۳۔ ”وما آتاکم الرسول فخذوه و ما نہاکم عنہ فالنہوا“ (مشرکے)

سے پورے اسلامی معاشرہ کا اس پر اتفاق ہے اور قرآنی نصوص بھی گواہی دیتی ہیں کہ اسلام کی اعلیٰ تعلیمات اور بندوں کے فرائض میں آنحضرت کا قول و عمل لوگوں کے لئے سند اور حجت ہے۔

اس کتاب کے چوتھے حصہ میں واضح طور سے بیان کیا گیا ہے کہ پیغمبر اکرم ﷺ کی رحلت کے ساتھ لوگوں کی تعلیم و تربیت کی ضرورت پوری نہیں ہوئی تھی اور ابھی اسلام کی علمی و عملی تحریک اپنے کمال کو نہیں پہنچی تھی کہ پھر سماج کو معصوم رہبروں کی ضرورت نہ رہے۔ لہذا ضروری ہے کہ رسول خدا کی رحلت کے بعد کوئی شخص یا جماعت اسلام کے احکام اور اس کے علمی، فکری و تربیتی اصول کی رہبری و مرجعیت کا عہدہ اس روز تک سنبھالے جب تک اسلام کا یہ انقلاب پوری طرح سے بارور ہو جائے۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ اس منصب و مقام کے لئے کون سے افراد شائستہ ہیں تاکہ اسلامی معاشرہ ہر عہد اور ہر زمانہ میں ان کے افکار و کردار و گفتار سے فائدہ اٹھائے۔ اور ان کی ہدایات و رہنمائی میں حلال خدا کو حرام سے اور واجبات کو محرمات سے تشخیص دے سکے۔ نتیجہ میں اپنے دینی فرائض پر عمل کر سکے۔ اس گروہ کی شناخت اور ان کی تعلیمات و ہدایات سے آگاہی حاصل کرنا ہر مسلمان پر لازم و ضروری ہے۔ اس کتاب میں اسی بات کی کوشش کی گئی ہے کہ پیغمبر اکرم کے شائستہ اور سچے جانشینوں کا تعارف کرایا جاسکے۔

ظاہر ہے کہ پیغمبر اسلام ﷺ کی رحلت کے بعد امت کی رہبری کی بحث کو پیش کرنے کا مطلب یہ ہرگز نہیں ہے کہ موجودہ حساس حالات میں مذہبی اختلافات کو بھڑکایا جائے یا تعصب آمیز اور بے شمر و غیر مفید بحث کو جاری رکھا جائے۔ کیونکہ ان حساس اور نازک حالات میں نہ صرف حالات کو پھیلنے سے روکا جانا ضروری ہے بلکہ انھیں کم سے کم کرنے کی کوشش کرنا چاہئے اور درحقیقت انسان کی عمر اس سے کہیں زیادہ قیمتی ہے کہ تعصب آمیز بحث چھیڑی جائے اور اپنی اور دوسروں کی عمر تباہ کی جائے۔ بلکہ مقصد یہ ہے کہ ہر طرح کے تعصب و کینہ سے دور رہ کر ایک اہم اور

اساسی مسئلہ کو واضح کرنے کے لئے حقائق کی بنیاد پر اس کی محققانہ اور منطقی تحقیق کی جائے۔ تاکہ اس کے نتیجہ میں مسلمانوں کے درمیان مزید قربت اور تقاضا ہم پیدا ہو اور وہ زہر افشائیاں ختم ہو جائیں جو ہمارے دانا دشمن اور نادان دوست اس سلسلہ میں کیا کرتے ہیں۔ امت کی رہبری سے مربوط بحثوں میں دو بنیادی اصل ہمارے پیش نظر ہیں:

۱۔ پیغمبر اکرم ﷺ کی جانشینی جیسے اہم مسئلہ میں حقائق و واقعات کو پہچانا جائے۔

۲۔ مسلمانوں کے درمیان مفاہمت اور قربت پیدا کرنے میں مدد کی جائے اور ان عوامل و اسباب کو برطرف کیا جائے جو سوء ظن کا باعث ہوتے ہیں اور جن سے دشمن فائدہ اٹھا کر ہم میں اختلاف پیدا کرتا ہے۔

اس کتاب کے مطالب چند برس پہلے تہران میں یونیورسٹی کے طلبہ کے لئے (حسینیہ سنی فاطمہ) میں درس کے طور پر بیان کے گئے تھے جو کافی حد تک لوگوں کو مکتب اہل بیت سے آشنا کرنے اور آنحضرت کے شائستہ جانشینوں کی معرفت کا باعث ہوئے تھے۔ جنہیں شائقین کے اصرار پر کتابی شکل میں شائع کیا جا رہا ہے یہ کتاب اس بحث کا پہلا حصہ ہے جو چوبیس فصلوں پر مشتمل ہے۔ انشاء اللہ دوسرا حصہ بھی جلد شائع ہوگا۔

وما توفیقی الا باللہ علیہ توکلت والیہ انیب

جعفر سبحانی

حوزہ عالیہ قم المقدسہ

اسلامی جمہوریہ ایران

پہلی فصل

امام کی شناخت کا فلسفہ

مسلمانوں کا اتحاد و یکجہتی ایک ایسی واضح چیز ہے جس کی ضرورت سے کسی بھی عقلمند کو انکار نہیں ہے، کیونکہ جو لوگ ایک کتاب کی پیروی کرتے ہیں اور اساسی و اصولی مسائل پر اتفاق رائے رکھتے ہیں وہ مختلف فرقوں، گروہوں و دشمن جماعتوں کی شکل میں کیوں رہیں اور ایک دوسرے کے خون کے پیا سے کیوں ہوں؟ اگر ماضی میں لوگوں کے اکثر طبقوں کو اس اتحاد کی ضرورت کا احساس نہیں تھا تو آج جب کہ استعماری طاقتیں اسلامی ممالک کے قلب پر حملہ آور ہیں اور ہر روز آگے بڑھتی نظر آتی ہیں ایسے میں ہر عاقل و ہوشیار شخص کو اتحاد کی ضرورت کا بھرپور احساس ہے۔

کون غیرت مند مسلمان ہوگا جو فلسطین، بوسنیہ، کشمیر، چچنیہ اور دنیا کے دوسرے علاقوں میں مسلمانوں کی ناقابل بیان حالت کو دیکھے اور خون کے آنسو نہ روئے اور اس بے حسی اور پراکندگی پر گریہ نہ کرے؟!

مسلمان، دنیا کی ایک چوتھائی جمعیت کو تشکیل دیتے ہیں۔ اور انسانی طاقت، زمینی ذخائر اور اصیل اسلامی ثقافت کے اعتبار سے دنیا کی سب سے زیادہ غنی جمعیت ہیں۔ ایسی مادی اور معنوی طاقتوں سے سرشار مسلمان سیاست کے میدان میں سب سے زیادہ باوزن ہو سکتے ہیں اور دنیا کی

سیاسی، اقتصادی اور ثقافتی قیادت ورہبری اپنے ہاتھ میں لے سکتے ہیں اور استعمار نیز اسلامی اتحاد کے مخالفوں کی بنائی ہوئی بہت سی جغرافیائی حدوں کو ناپیدہ قرار دے کر مسلمانوں کی باہمی ضرورتیں پوری کر سکتے ہیں نیز اقتصادی و ثقافتی مبادلات کے ذریعہ اپنے حالات بہتر بنا سکتے ہیں۔ اس طرح اپنی سیادت و سرداری دوبارہ حاصل کر سکتے ہیں لیکن اتحاد کی اس اہمیت کو مد نظر رکھنے کے باوجود امام کی شناخت و معرفت کے موضوع کو اسلامی اتحاد کی راہ کا نشانہ نہیں سمجھنا چاہئے اور اسے اس اتحاد کی راہ میں رکاوٹ نہیں سمجھنا چاہئے، جس کی ضرورت کو ابھی محسوس کرتے ہیں۔

اکثر دیکھا گیا ہے کہ بعض سادہ لوح یا فریب خوردہ جوان اسلامی اتحاد کو حضرت عثمان کا کرتہ بنا کر طالبان حقیقت پر سخت تنقید کرتے ہوئے کہتے ہیں:

ابو بکر و علیؓ کی خلافت کی بحث اور یہ کہ صحیح جانشین کون ہے ایک غیر مفید اور بے ثمر بحث ہے۔ اس لئے کہ زمانہ کا پہیاب چھپے نہیں گھومے گا اور ہم پیغمبر ﷺ کے حقیقی جانشین کو زندہ نہیں کر پائیں گے کہ اسے اس کا حق دلائیں اور مسند خلافت پر بٹھائیں اور مخالف کی تنبیہ اور اس کا مواخذہ کریں پس بہتر ہے کہ یہ فائل ہمیشہ کے لئے بند کر دی جائے اور اس کے بجائے کوئی دوسری گفتگو کی جائے!

اس خیال کے حامل افراد اس بحث کے درختان نتائج سے غافل ہیں لہذا انھوں نے اسے غیر اہم، بے فائدہ اور اسلامی اتحاد کی راہ میں رکاوٹ تصور کیا ہے، لیکن ہمارے خیال سے یہ فکر امام شناسی کے فلسفہ سے غفلت اور لاعلمی کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے کیوں کہ اگر اس بحث کا مقصد جھوٹے دعویداروں کے درمیان صرف پیغمبر ﷺ کے حقیقی جانشین کا پہچانا ہو تو اس صورت میں ممکن ہے کہ اس طرح کی بحثوں کو غیر مفید و بے ثمر کہیں اور افراطیوں کی طرح جو ہر طرح کی علمی و منطقی بحث کو اسلامی اتحاد کے خلاف سمجھتے ہیں ہم بھی اسے اتحاد کی راہ کا نشانہ سمجھیں۔ اس لئے کہ اب کیا فائدہ ہے کہ چودہ صدیوں کے بعد حق کو ناحق سے تشخص دینے کی کوشش کی جائے اور غاصب کے خلاف

ایک غائبانہ حکم صادر کیا جائے جس کی کوئی عملی ضمانت نہیں ہے۔

لیکن یہ اعتراض اس وقت بیجا ہے جب ہم علمائے اہل سنت کی طرح اسلامی امامت و خلافت کو ایک طرح کا عرفی منصب چاہیں جس کا فریضہ اسلامی سرحدوں کی حفاظت کرنا، دفاعی طاقتوں کو مضبوط کرنا، عدل و انصاف کو رواج دینا، حدود الہی کو قائم کرنا اور مظلوموں کو ان کا حق دلانا وغیرہ ہو، کیونکہ اس صورت میں اس قسم کی بحثوں کی نوعیت یہ ہوگی کہ ہم بیٹھ کر یہ بحث کریں کہ پندرہویں صدی عیسوی میں برطانیہ پر کس شخص کی حکومت تھی یا کوئی پنجم کے بعد تخت حکومت پر بیٹھنے کا حق کس کو تھا؟!

لیکن شیعی نقطہ نظر سے جو امامت کو رسالت کا سلسلہ اور نبوت کے فیض معنوی کا تترہ سمجھتے ہیں، اس طرح کی بحث لازمی و ضروری ہے کیونکہ اس صورت میں امام کے فرائض صرف مذکورہ بالا امور میں ہی خلاصہ نہیں ہوتے ہیں۔ بلکہ ان تمام امور کے علاوہ امام، حضرت رسول خدا ﷺ کی رحلت کے بعد احکام الہی کو بیان کرنے والا، قرآن کی مشکل آیات کا مفسر اور حرام و حلال کو بتانے والا بھی ہے۔ اس صورت میں یہ سوال پیش آتا ہے کہ پیغمبر اسلام ﷺ کی رحلت کے بعد مسلمانوں کو احکام الہی کی تعلیم دینے اور حرام و حلال بتانے والا کون ہے تاکہ پیش آنے والے نئے مسائل میں قرآن کی نص اور پیغمبر اکرم ﷺ کی کوئی معتبر حدیث موجود نہ ہونے کی صورت میں مسلمان اس کی طرف رجوع کریں اور اس کا قول ان موارد میں حجت قرار پائے۔ ۱۔

اصولاً اسلامی امت قرآن کے مشکلات اور اختلافی مسائل میں کہ جن کی تعداد محدود بھی نہیں ہے آخر کس صاحب منصب کی طرف رجوع کریں اور کس کے قول و عمل کو اپنی زندگی کے لئے حجت اور چراغ راہ قرار دیں؟ ۲۔

یہی وہ منزل ہے جہاں ہم رسول خدا ﷺ کے علمی جانشین کے بارے میں بحث کی ضرورت محسوس کرتے ہیں اور یہاں یہ مسئلہ مکمل طور سے زندہ صورت اختیار کر لیتا ہے کیونکہ اس نظریہ کی روشنی میں امام، الہی معارف اور اصول و احکام میں امت کا رہنما ہوتا ہے اور جب تک یہ منصب قطعی دلائل کے ذریعہ پہچانا نہ جائے صحیح نتیجہ تک نہیں پہنچا جاسکتا۔

اگر مسلمان تمام اصول و فروع میں اتفاق و اتحاد رکھتے تو امامت کے سلسلہ میں بحث اس قدر ضروری نہ ہوتی، لیکن افسوس کہ ان کے یہاں کم ہی مسائل میں اتحاد پایا جاتا ہے۔ اب ہم جو پیغمبر اسلام ﷺ کی رحلت کے چودہ سو سال بعد وجود میں آئے ہیں، ہمارا وظیفہ کیا ہے؟ آیا اس زمانہ میں پیدا ہونے والے مسائل، مشکلات قرآن اور اختلافی مسائل میں کسی نہ کسی صحابی کی رائے مجملہ (ابوصنیفہ یا شافعی) کی طرف رجوع کریں یا حضرت علیؑ اور ان کی گرانقدر اولاد کی طرف رجوع کریں جن کے لئے شیعوں کا دعویٰ ہے کہ ان کی فضیلت، عصمت، طہارت، وسع و عمیق علم اور پیغمبر اسلام ﷺ کی جانب سے ان کے منصب امامت پر فائز کئے جانے کے سلسلہ میں عقلی و نقلی دلائل موجود ہیں؟

اس سوال کا جواب اسی ”امام شناسی“ کے موضوع اور ولایت کی بحث میں ملے گا جس میں تحقیق، انسان کو مذکورہ بالا مشکلات میں حیرت و سرگردانی سے نجات دے دیگی۔ حتیٰ اگر ہم مسئلہ خلافت کو بھی چھوڑ دیں اور پیغمبر اکرم ﷺ کے بعد مسلمانوں کی سرپرستی و حاکمیت جو حقیقت میں ایک معصوم کا حصہ ہے، سے چشم پوشی کر لیں تو صرف اسی مسئلہ کی تحقیق کہ پیغمبر اکرم ﷺ کی رحلت کے بعد مسلمانوں کا دینی و علمی مرجع و راہنما کون ہے، بہت سی جہات سے بڑی اہمیت رکھتا ہے اور مسلمانوں کی مکمل سعادت و خوشنختی بھی اس سے وابستہ ہے اس لئے ضروری ہے کہ جو باتیں ہم بعد میں وضاحت کے ساتھ بیان کریں گے یہاں بہت اختصار کے ساتھ ذکر کر دیں:

اگر ہم اس وقت خلافت و حاکمیت کے مسئلہ سے صرف نظر کر دیں تو پورے اطمینان کے

ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ پیغمبر اکرم ﷺ کی مکرر تصریحات و تاکیدات کی روشنی میں آپ کی رحلت کے بعد مسلمانوں کے پاس قرآن کے علاوہ صرف ایک دینی و علمی مرجع و ملجأ ہے اور وہ پیغمبر اکرم ﷺ کے اہل بیت علیہم السلام ہیں، کیونکہ آنحضرتؐ نے مختلف موقعوں پر کتاب و عترت کے اٹوٹ رشتہ کو صراحت کے ساتھ بیان کیا ہے:

”یا ایہا الناس انی یوشک ان ادعی فاجیب و انی تارک
فیکم الثقلین کتاب اللہ و عترتی کتاب اللہ حبل ممدود من
السماء الی الارض و عترتی اهل بیتی و ان اللطیف اخبرنی
انہما لن یفترقا“

”اے لوگو! میں عنقریب خدا کی دعوت پر لبیک کہنے والا ہوں۔ میں تمہارے
درمیان دو گرانقدر اور سنگین امانتیں چھوڑے جا رہا ہوں۔ ایک اللہ کی کتاب
اور دوسری میری عترت ہے۔ اللہ کی کتاب وحی الہی اور ربسمان نجات ہے
جو آسمان سے زمین تک پھیلی ہوئی ہے اور میری عترت اور اہل بیت۔
خدائے لطیف نے مجھے خبر دی ہے کہ یہ دونوں ہرگز جدا نہیں ہوں گے“

پیغمبر اکرم ﷺ نے ان دونوں حجّتوں کی باہم ملازمت کو دینے آخری حج کے روز عرفہ یا
غدیر کے دن منبر سے یا اپنی بیماری کے دوران بستر پر لیٹے ہوئے جب کہ آپ کا حجرہ اصحاب سے بھرا
ہوا تھا صراحت سے بیان کیا اور آخر میں فرمایا ہے کہ:

”هذا علی مع القرآن و القرآن مع علی لا یفترقان“^۱
یہ علی ہمیشہ قرآن کے ساتھ ہیں اور قرآن علی کے ہمراہ ہے۔ یہ دونوں ایک

دوسرے سے جدا نہیں ہوں گے۔

حدیث ثقلین کے مدارک اور حوالے ایک دو نہیں ہیں جن کو یہاں ذکر کر دیا جائے۔ اس حدیث کے مدارک علامہ میر حامد حسین ہندی نے اپنی گرانقدر کتاب ”معوقات الانوار“ کی بارہویں جلد میں بیان کئے ہیں اور یہ کتاب ہندوستان میں چھپ چکی ہے اور چند سال پہلے چھ جلدوں میں اصفہان میں بھی دوبارہ چھپی ہے، اور دار الشوریب مصر سے بھی اس سلسلہ میں ایک کتاب چھپ چکی ہے جس کی بنیاد پر جامعہ الازہر کے سربراہ شیخ شلتوت نے چار مذاہب کی پیروی کے انحصار کو توڑا اور فتوایا کہ فقہ امامیہ کی پیروی بھی صحیح اور مجزی ہے۔ شیخ شلتوت سے پوچھا گیا کہ بعض لوگوں کا اعتقاد ہے کہ ہر مسلمان پر لازم ہے کہ اپنی عبادات اور معاملات صحیح کرنے کے لئے چار مشہور مذاہب (حنفی، مالکی، شافعی، حنبلی) کی تقلید کرے کہ شیعہ اثنا عشری اور زیدی مذاہب ان میں سے نہیں ہیں، کیا جناب عالی بھی اس کلی نظریہ سے اتفاق رکھتے ہیں اور اثنا عشری مذاہب کی تقلید و پیروی کو منع فرماتے ہیں؟ تو انہوں نے جواب میں کہا:

۱۔ اسلام نے اپنے کسی پیروکار پر یہ واجب نہیں کیا ہے کہ (فرعی احکام میں) کسی معین مذاہب کی پیروی کرے۔ ہم کہتے ہیں کہ ہر مسلمان کو یہ حق ہے کہ ہر اس مذاہب کی پیروی کرے جو صحیح مدارک کے مطابق ہم تک نقل ہوا ہے اور اس کے احکام کو مخصوص کتابوں میں تدوین کیا گیا ہے۔ اسی طرح جن لوگوں نے کسی ایک مذاہب کی پیروی کی ہے — چاہے وہ جو بھی مذاہب ہو — وہ دوسرے مذاہب کی طرف رجوع کر سکتے ہیں اور اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔

۲۔ جعفری مذاہب، مشہور اثنا عشری امامیہ مذاہب ہے اور ان مذاہبوں میں سے ہے کہ اہل سنت کے تمام مذاہبوں کی طرح اس کی بھی تقلید کی جاسکتی ہے۔

لہذا بہتر ہے کہ تمام مسلمان اس حقیقت سے آگاہ ہوں اور کسی خاص مذاہب سے تعصب کرنے سے پرہیز کریں کیونکہ اللہ کا دین اور اس کا قانون کسی خاص مذاہب کے تابع اور کسی معین و

مخصوص مذہب میں منحصر نہیں ہے۔ (اسلامی مذاہب کے پیشوا) سب مجتہدین اور خداوند عالم کے نزدیک مقبول ہیں اور جو لوگ اہل نظر اور صاحب اجتہاد نہیں ہیں ان کے لئے جائز ہے کہ ان حضرات کی تقلید کریں اور جو کچھ انہوں نے فقہ میں مقرر کیا ہے اس پر عمل کریں۔ اس سلسلہ میں عبادات و معاملات میں کوئی فرق نہیں ہے۔

امامت کے سلسلہ میں دو نظریے

خلافت، علمائے اہل سنت کی نظر میں، ایک ایسا اجتماعی و سماجی عہدہ و منصب ہے جس کے لئے اس سے مخصوص مقاصد کی لیاقت و شائستگی کے علاوہ کوئی اور شرط نہیں ہے۔ جب کہ شیعہ نقطہ نظر سے امامت ایک الہی منصب ہے جس کا تعین خدا کی طرف سے ضروری ہے اور وہ بہت سے حالات اور ذمہ داریوں میں پیغمبر ﷺ کے برابر و یکساں ہے۔

لہذا امامت کی حقیقت کے سلسلے میں علماء کے یہاں دو نظریے پائے جاتے ہیں ایک نظریہ اہل سنت کے علماء کا ہے اور دوسرا شیعہ علماء کا نظریہ ہے:

الف۔ علمائے اہل سنت کا نظریہ:

علمائے اہل سنت کی عقائد و کلام کی کتابیں اس بات کی حکایت کرتی ہیں کہ امامت ان کی نظر میں وسیع پیمانہ پر مسلمانوں کے دینی و دنیوی امور کی سرپرستی ہے اور خود ”امام“ اور ان کی اصطلاح میں ”خليفة“ وہ شخص ہے جو پیغمبر اکرم ﷺ کی رحلت کے بعد اس منصب کا ذمہ دار ہے اور مسلمانوں کے دینی و دنیاوی امور سے مربوط ہر گزہ اسی کے ذریعہ کھلتی ہے۔

یہ علماء، امامت کی یوں تعریف کرتے ہیں:

”الامامة رئاسة عامة في امور الدين و الدنيا خلافة عن النبي ﷺ“
 اہل سنت کے نظریہ کے مطابق یہ عظیم دینی و اجتماعی عہدہ و منصب ایک سماجی بخشش ہے جو لوگوں کی طرف سے خلیفہ کو عطا ہوئی ہے اور خلیفہ انتخاب کے ذریعہ اس مرتبہ پر فائز ہوا ہے۔ خلیفہ کی ذمہ داریوں کا دائرہ بھی مذکورہ تعریف میں پورے طور سے مشخص کر دیا گیا ہے۔
 الف:- دینی امور کی سرپرستی: اس سے مراد یہ ہے کہ لوگوں کے دینی مشکلات خلیفہ کے ہاتھوں حل ہوتے ہیں مثلاً پوری دنیا میں جہاد کے ذریعہ اسلام کی توسیع ایک دینی امر ہے جس کا عہدہ دار امام کو ہونا چاہئے۔

ب:- دنیاوی امور کی سرپرستی: امام و خلیفہ کو چاہئے کہ طاقت کے ذریعہ عمومی امن و امان قائم کرے اور لوگوں کے اموال ان کی ناموس اور ملک کی سرحدوں کی حفاظت کرے۔
 اس تعریف اور خلیفہ کے سپرد کی گئی ذمہ داریوں پر غور کرنے سے ایک حقیقت سامنے آتی ہے اور وہ یہ کہ امام یا خلیفہ ان کے نقطہ نظر سے ایک فرعی اور ایک سماجی حاکم ہے جو ملکی قوانین کا اجراء کرنے عمومی امن و امان قائم کرنے اور سماجی عدل و انصاف برقرار کرنے کے لئے منتخب ہوا ہے اور اس طرح کی حاکمیت کے لئے لیاقت و شائستگی کے علاوہ کسی اور چیز کی شرط نہیں ہے (نہ اسلامی احکام کے کلی و وسیع علم کی ضرورت ہے اور نہ یہ وہ خطا سے معصوم ہونے کی ضرورت ہے)

دوسرے لفظوں میں کوئی بھی معاشرہ چاہے جتنا بھی گناہ اور فساد سے پاک ہو پھر بھی برائی پورے طور سے اس سے دور نہیں ہوتی اور کہیں نہ کہیں گوشہ و کنار میں ایسے شریر افراد ضرور نظر آتے ہیں

۱- شرح تجرید علماء الدین توحشی ص ۲۷۳-۲۷۴۔ اس کے علاوہ اور بھی تعریفیں علماء اہل سنت نے بیان کی ہیں لیکن اختصار کے پیش نظر ہم

جو جو شراب کی طرف ہاتھ بڑھاتے نظر آتے ہیں یا لوگوں کے عمومی اموال و جائیداد پر زبردستی ڈاکا ڈالتے ہیں اور ان پر قابض ہو جاتے ہیں یا لوگوں کی عزت و ناموس پر حملے کی فکر میں رہتے ہیں۔

اس لئے پیغمبر اکرم ﷺ کی رحلت کے بعد ایک ایسے شائستہ و لائق شخص کی ضرورت ہے جو گناہ گاروں اور فساد یوں کی الہی قانون کی روشنی میں تنبیہ کر کے اس طرح کی برائیوں اور آلودگیوں کو روکے۔ یہ اور اسی طرح کے امور وہ ہیں جو انسان کی دنیا سے مربوط ہیں، جن کی سرپرستی پیغمبر ﷺ کی رحلت کے بعد امام کے حوالے کی گئی ہے۔

مذکورہ امور کے مقابل کچھ دوسرے امور بھی ہیں جو دنیا میں اسلام کی ترقی اور پھیلاؤ سے مربوط ہیں اور جن کا تعلق انسان کے دین سے ہے۔ مثلاً امام کا ایک فریضہ یہ ہے کہ اسلحوں سے لیس ایک منظم اور مضبوط فوج تیار کرے جو نہ صرف اسلامی سرحدوں کو ہر طرح کے باہری حملوں سے محفوظ رکھے بلکہ اگر ممکن ہو تو جہاد کے ذریعہ توحید کا پیغام پوری دنیا میں پھیلا سکے۔

اب یہاں آپ یہ کہیں گے کہ پھر لوگ اپنے حرام و حلال اور دینی و علمی مسائل کس سے دریافت کریں گے، اور اس عہدہ کا ذمہ دار کون ہوگا؟ تو اس کے جواب میں علمائے اہل سنت کہیں گے کہ اصحاب پیغمبر ﷺ جنہوں نے آنحضرتؐ سے حرام و حلال کے احکام سیکھے ہیں اس طرح کے مسائل میں امت کے مرجع ہیں۔

اگر امام کی ذمہ داری ان ہی امور کی دیکھ بھال میں منحصر ہو، جنہیں ہم نے اہل سنت کی زبانی نقل کیا ہے، تو ظاہر ہے کہ ایسے امام کے لئے صرف تھوڑی سی لیاقت و شائستگی کے علاوہ کسی بھی اخلاقی فضیلت اور انسانی کمال کی ضرورت نہیں ہے، چہ جائیکہ اس کے بارے میں وسیع علم اور خطا و گناہ سے بچانے والی عصمت کی شرط رکھی جائے۔

افسوس کہ امام کا معنوی و روحانی مرتبہ و منصب اہل سنت کی نظر میں رفتہ رفتہ اس قدر گر گیا

کہ قاضی باقلائی جیسا شخص پیغمبر اکرم ﷺ کے جانشین کے بارے میں اس طرح کی باتیں کرتا ہے کہ خلیفہ و امام پست ترین اخلاقی خصلتوں کی غلاظت اور اپنے کالے سیاسی کارناموں کے باوجود امت کی قیادت و رہبری کے منصب پر باقی رہ سکتا ہے! وہ کہتا ہے:

”لا یخلع الامام بفسقه و ظلمه بغصب الاموال و تناول

النفوس المحترمة و تصبیح الحقوق و تعطیل الحدود“ ۱

یعنی امام اپنے فسق و فجور اور ظلم کے ذریعہ لوگوں کے اموال غصب کر کے، محترم افراد کو قتل کر کے، حقوق کو ضائع کر کے اور الہی حدود و قوانین کو معطل کر کے بھی اپنے منصب سے معزول نہیں ہوتا بلکہ یہ امت پر ہے کہ اس کی برائیوں کو درست کریں اور اس کی وہدایت کریں!

اور ہمیں مزید تعجب نہ ہوگا اگر ہم محقق تفتازانی جیسے عالم کو خلیفہ پیغمبر ﷺ کے بارہ میں

ایسے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے دیکھیں، وہ لکھتے ہیں:

یہ ہرگز ضروری نہیں کہ امام لغزش اور گناہ سے پاک ہو یا امت کی سب سے اعلیٰ فرد شمار ہو۔

امام کی نافرمانی اور الہی احکام سے اس کی جہالت منصب خلافت سے اس کی معزولی کا سبب ہرگز نہیں ہو سکتی۔ ۲

خلیفہ اسلام کے بارے میں اس طرح کے فیصلوں اور نظریوں کی بنیاد یہ ہے کہ ان لوگوں نے امام کو ایک عرفی اور انتخابی حاکم سمجھ لیا ہے۔ کیونکہ ایک عرفی حاکم کے لئے بنیادی شرط یہ ہے کہ وہ نظام کو چلانے اور معاشرہ میں آرام و سکون برقرار کرنے کی لازمی صلاحیت رکھتا ہو اور فساد یوں کو کنٹرول کر سکے۔ خود اس کا گناہ سے آلودہ ہونا یا اس کی غلطیاں اس منصب کی راہ میں رکاوٹ نہیں بنتیں جس کے لئے وہ منتخب ہوا ہے۔

۱۔ التبیہ ص ۱۸۶

۲۔ شرح مقاصد، ج ۲، ص ۱۷۱

ب۔ شیعہ علماء کا نظریہ:

مذکورہ بالا نظریہ کے مقابل ایک دوسرا نظریہ بھی ہے جس پر شیعہ علماء تکیہ کرتے ہیں۔ یہ نظریہ کہتا ہے کہ: امامت ایک طرح کی الہی ولایت ہے جو خداوند عالم کی جانب سے بندہ کو دی جاتی ہے۔ واضح الفاظ میں یوں کہیں کہ: امامت، نبوت کی طرح ایک انتصابی منصب ہے اور اس کا عہدہ دار خود خدا کی طرف سے، معین و منصوب ہوتا ہے۔

اس بنیاد پر امام رسالت ہی کا سلسلہ ہے فرق یہ ہے کہ پیغمبر شریعت کی بنیاد رکھنے والا اور آسمانی پیام لانے والا ہے اور امام شریعت کو بیان کرنے والا اور اس کا محافظ و نگہبان ہے۔ امام، نزول وحی کے علاوہ تمام مراتب میں پیغمبر اکرم ﷺ کے برابر اور قدم بقدم ہے اور وہ تمام شرائط جو پیغمبر ﷺ کے لئے ضروری و لازم قرار دیے گئے ہیں (مثلاً اسلام کے معارف، اس کے اصول و فروع اور احکام کا علم اور ہر طرح کی خطا و گناہ سے اس کا محفوظ ہونا) بعینہ امام کے لئے بھی لازم و ضروری ہیں۔

یہ نظریہ رکھنے والے معتقد ہیں کہ: صحیح ہے کہ پیغمبر اکرم ﷺ لوگوں کے لئے مکمل دستور حیات لائے اور انہوں نے اسلامی تعلیمات اور دین حق کے تمام کلیات لوگوں کے حوالے کر دیئے لیکن پیغمبر اکرم ﷺ کی حیات کے بعد کوئی تو ایسا شخص ہونا چاہئے جو ان کلیات سے جزئی احکام کو استنباط کرے اور نکالے اور یہ کام علم (اور وہ بھی وسیع اور خدا داد علم) کے بغیر ممکن نہیں ہے۔

صحیح ہے کہ اسلام کے تمام احکام کی تشریح پیغمبر ﷺ کے زمانہ میں ہوئی ہے اور یہ احکام وحی الہی کے ذریعہ انہیں بتائے گئے ہیں۔ لیکن مساعد حالات نہ ہونے یا روزانہ پیش آنے والے نئے مسائل کے حل کے لئے احکام کا بیان امام کے ذمہ بھی کیا گیا ہے، اور اس منصب کا سنبھالنا اللہ سے وابستہ اور مستند علم کے بغیر ممکن نہیں ہے۔ اسی لئے شیعوں کا اعتقاد ہے کہ امام کو شریعت کے تمام

امور سے واقف و آگاہ ہونا چاہئے۔ ا۔

لیکن امام معصوم کیوں ہو؟ تو جواب یہ ہے کہ شیعہ امام کو امت کا معلم و مربی جانتے ہیں اور تربیت سب سے زیادہ عملی پہلو رکھتی ہے اور مربی کے عمل کے ذریعہ انجام پانی چاہئے۔ اگر مربی خود قانون توڑنے والا اور حدود کو پہچاننے والا نہ ہو تو لوگوں پر مثبت اثر کیسے ڈال سکے گا؟ لہذا یہ نظریہ کہتا ہے کہ امت کے لئے ایسے شخص کی شناخت و وسیع و خداداد علم اور ہمہ جہت عصمت کے ذریعہ ہی ممکن ہے اور امام کو خدا کی جانب سے منصوب ہونا چاہئے۔

یہ دو نظریے ہیں جو ان دونوں گروہوں کے علماء کے ذریعہ بیان ہوئے ہیں۔ اب ہم دیکھیں کہ ان میں سے کون سا نظریہ صحیح و استوار نیز قرآنی آیات اور پیغمبر اکرم ﷺ کی معتبر حدیث سے سازگار ہے۔

۱۔ چونکہ شیعہ علماء اہل سنت کے نظریے کے برخلاف، امامت کو ایک الہی منصب سمجھتے ہیں لہذا وہ امامت کی یوں تعریف کرتے ہیں "الامامة رئاسة عامة الهيئة في امور الدين و الدنيا و خلافة عن النبي" امامت لوگوں کے دینی و دنیاوی امور میں ایک عام الہی سرپرستی اور پیغمبر ﷺ کے جانشینی ہے۔

تیسری فصل

شیعہ نظریہ کی صحت کی دلیلیں

عقلی اور نقلی دلائل گواہی دیتے ہیں کہ امامت کا منصب نبوت کے مانند ایک الہی منصب ہے اور امام کو خدا کی جانب سے معین ہونا چاہئے اور جو شرائط پیغمبر ﷺ کے لئے (وحی اور بانی شریعت ہونے کے علاوہ) معتبر ہیں وہ امام میں ہونے چاہئے۔

اب ہم دلائل کا جائزہ لیتے ہیں:
پیش آنے والے نئے مسائل:

پیغمبر اکرم ﷺ نے اپنی حیات طیبہ میں اسلام کے اصول و فروع کے تمام کلیات بیان کر دیئے تھے اور اسلام اسی طریقہ سے خود پیغمبر اسلام ﷺ کے ہاتھوں تکمیل پایا۔ لیکن کیا یہ اصول و کلیات امت کی علمی ضرورتوں کو پورا کرنے والی کسی مرکزی علمی شخصیت کے بغیر کافی ہیں؟ یہ طے شدہ بات ہے کہ کافی نہیں ہیں۔ بلکہ آنحضرتؐ کے بعد ایسے معصوم پیشواؤں کی ضرورت ہے جو اپنے وسیع و بے پایاں عظیم علم کے ذریعہ کلیات قرآن و اصول اور سنت پیغمبر ﷺ کی روشنی میں پیش آنے والے مختلف مسائل میں امت کی علمی ضرورت کی تکمیل کریں۔ خصوصاً ایسے مسائل میں جو پیغمبر ﷺ کے زمانہ میں پیش نہیں آئے تھے اور نہ حضرتؐ کے زمانہ میں اس کی کوئی مثال ملتی ہے۔

دوسرے لفظوں میں یوں سمجھئے کہ پیغمبر اسلام ﷺ نے اپنی بعثت کے بعد رسالت کے تیرہ سال مکہ میں بت پرستوں کے خلاف جدوجہد میں بسر کئے۔ اور اس عرصہ میں حالات اور ماحول سازگار نہ ہونے کی وجہ سے آپؐ الہی شریعت کے احکام بیان کرتے ہیں کامیاب نہ ہوئے بلکہ آپؐ نے اپنی پوری توجہ اسلامی اصول و مبدا اور معاہدے یعنی توحید و قیامت کے سلسلہ میں لوگوں کا ذہن ہموار کرنے میں صرف کی، اور چونکہ حرام و حلال اور الہی فرائض و سنن بیان کرنے کے حالات نہیں تھے، لہذا آپؐ نے احکام کے اس حصہ کو بعد کے لئے اٹھا رکھا۔

جب آنحضرتؐ مدینہ منورہ تشریف لائے تو آپ کے سامنے مسائل و مشکلات کا ایک لشکر تھا۔ مدینہ میں آپؐ کی زندگی دس سال سے زیادہ نہ رہی لیکن آپؐ نے اسی مدت میں ستائیس مرتبہ خود بت پرستوں نیز مدینہ اور خیبر کے یہودیوں کے خلاف جنگوں میں شرکت فرمائی۔ دوسری طرف منافقوں کی سازشوں نیز اہل کتاب سے مناظرہ و مجادلہ میں بھی آپؐ کا بڑا قیمتی وقت صرف ہوا۔

یہ حادثات و واقعات سب بنے کہ پیغمبر اکرم ﷺ اپنی رسالت کے دوران زیادہ تر اسلام کے فروع و احکام کے کلیات بیان کریں اور ان کلیات سے دوسرے احکام کے استنباط و استخراج کا کام دوسرے شخص کے حوالے کیا جائے۔

اگر قرآن یہ فرماتا ہے کہ ”الیوم اکملت لکم دینکم“۔ تو اس سے پیغمبر اکرم ﷺ اور اسلام کی اس وقت کی حالت و کیفیت کو دیکھتے ہوئے آیت کے نزول یعنی دس ہجری کے وقت مراد یہ ہے کہ توحید و قیامت سے متعلق معارف و عقائد اور فروع و احکام کے تمام اصول و کلیات آیت کے نزول کے وقت خود پیغمبر اکرم ﷺ کے ہاتھوں تکمیل ہو گئے اور اس اعتبار سے دین کے ارکان میں کوئی نقص باقی نہیں رہا اور یہی کلیات صبح قیامت تک

امت کو پیش آنے والے مسائل کا حل تلاش کرنے میں بنیاد و اساس کا کام کریں گے۔
اب یہ دیکھنا چاہئے کہ کون سا شخص ان اصول و کلیات کے ذریعہ اسلامی معاشرہ کی تمام ضرورتوں اور مسائل کا جواب دے سکتا ہے۔ احکام سے متعلق قرآن میں ذکر شدہ آیات اور پیغمبر اکرمؐ کی محدود احادیث کے ذریعہ صبح قیامت تک پیش آنے والے بے شمار مسائل کا حل اور احکام کا استنباط کرنا بہت ہی دشوار اور پیچیدہ کام ہے جو عام افراد کے بس کا نہیں ہے۔ کیونکہ قرآن مجید میں فقہی و شرعی احکام سے متعلق آیات کی تعداد تین سو سے زیادہ نہیں ہے۔ اسی طرح سے حلال و حرام اور فرائض سے متعلق آنحضرتؐ کی احادیث کی تعداد چار سو سے زیادہ نہیں ہے اور ایک عام انسان اپنے محدود علم کے ذریعہ ان محدود مدارک سے مسلمانوں کے روز افزوں مسائل و مشکلات کا حل نکال نہیں سکتا۔ بلکہ اس کے لئے ایک ایسے لائق اور شائستہ شخص کی ضرورت ہے جو اپنے الہی اور نبوی علم کے ذریعہ ان محدود دلائل سے الہی احکام نکال کر امت کے حوالے کر سکتا ہو۔

ساتھ ہی ساتھ ایسا شخص اپنے اس وسیع و لامحدود علم کی وجہ سے گناہ و خطا سے محفوظ بھی ہونا چاہئے تاکہ لوگ اس پر اعتماد کر سکیں اور ایسے شخص کو خدا کے علاوہ کوئی اور نہیں جانتا لہذا وہی اسے معین بھی فرمائے گا۔

تکمیل دین کی دوسری نوعیت

یہاں ایک دوسری بات بھی کہی جاسکتی ہے، اور وہ یہ ہے کہ آیت اکمال جو اسلام کی تکمیل سے متعلق ہے اسلام کی بقا دوام کو بیان کر رہی ہے۔ کیونکہ یہ آیت کریمہ اسلامی محدثین کی متعدد و متواتر روایات کے مطابق غدیر کے دن حضرت علیؑ کی ولایت و خلافت کے اعلان کے بعد نازل ہوئی ہے۔ اب رہی فرائض و محرمات اور دوسرے احکام سے متعلق تکمیل دین کی بات تو یہ اس آیت کے مقصد سے باہر کی چیز ہے۔ اس حصہ میں اسلام کے مسلمات کو مد نظر رکھتے ہوئے یہ کہا جانا چاہئے کہ اس میں کوئی کلام نہیں ہے کہ پیغمبر اکرمؐ کی رحلت کے بعد وحی الہی کا سلسلہ منقطع ہو

گیا اور اب کوئی امین وحی کسی اسلامی حکم کو لیکر نہیں آئے گا، بلکہ انسان کو صبح قیامت تک جن چیزوں کی ضرورت تھی وہ سب جبرئیل امین رسول خدا ﷺ کے پاس لاپچھے۔ دوسری طرف ہم دیکھتے ہیں کہ دنیا کے تمام ہونے تک اسلامی معاشرہ کو پیش آنے والے مسائل کا حکم بیان کرنے کے لئے فقہی دلائل ہمارے پاس کافی نہیں ہیں بلکہ بہت سے احکام قرآن و حدیث میں بیان ہی نہیں کئے گئے ہیں۔

ان دو باتوں کو مد نظر رکھتے ہوئے ہم یہ کہنے پر مجبور ہیں کہ تمام الہی احکام خود پیغمبر اکرمؐ کے زمانہ میں آچکے تھے اور آپؐ کو ان کی تعلیم دی جا چکی تھی۔ اب چونکہ رسالت کی مدت بہت ہی مختصر تھی، ساتھ ہی ہر روز کے مسائل اور دشواریاں، نتیجہ میں آپؐ ان تمام احکام کی تبلیغ کرنے میں کامیاب نہیں ہوئے لہذا آپؐ نے وہ تمام تعلیمات الہی اور جو کچھ بھی آپؐ نے وحی کے ذریعہ الہی احکام اور اسلامی اصول و فروع کی شکل میں حاصل کیا تھا سب کچھ اپنے اس وصی و جانشین کے حوالے کر دیا اور اسے سکھا دیا، جو خود آنحضرتؐ کی طرح خطا و غلطی سے بری اور محفوظ تھا۔ تاکہ وہ آپؐ کے بعد یہ تعلیمات اور احکام رفتہ رفتہ امت کو بتائے۔ ظاہر ہے کہ ایسے شخص کی شناخت جو اس قدر وسیع علم رکھتا ہو اور ہر طرح کی خطا و لغزش سے پاک ہو صرف پیغمبر اکرمؐ کے تعارف اور اللہ کی جانب سے نصب و تعیین کے ذریعہ ہی ممکن ہے۔ امت انتخابات کے ذریعہ ایسے کسی شخص کو نہیں پہچان سکتی۔

یہ بھی عرض کر دوں کہ ہم جو یہ کہتے ہیں کہ پیغمبر اکرمؐ جو کچھ امت سے بیان نہ کر سکے وہ انہوں نے اپنے وصی و جانشین کو تعلیم دے دیا تو اس سے مراد وہ معمولی تعلیم نہیں ہے جو ایک شاگرد اپنے استاد سے چند پرسوں میں حاصل کرتا ہے کیوں کہ اگر ایسا ہوتا تو پیغمبر اکرمؐ ایک شخص کو اس طرح کی تربیت دینے کے بجائے ایک گروہ یا بہت سے لوگوں کی تعلیم و تربیت فرماتے۔ جب کہ یہ تعلیم ایک غیر معمولی تعلیم تھی جس میں آنحضرتؐ نے اپنے وصی کی روح و قلب پر تصرف فرما کر

تھوڑی ہی دیر میں اسلام کے تمام حقائق و تعلیمات سے انھیں آگاہ کر دیا اور کوئی چیز پیغمبر ﷺ کے جانشین سے مخفی و پوشیدہ نہیں رہ گئی۔

آخر میں یہ یاد دہانی بھی کرادوں کہ جب اسلام دنیا کے مختلف علاقوں میں پھیلا تو مسلمان نئے نئے حالات سے دوچار ہوئے جن سے پیغمبر اسلام ﷺ کے عہد میں سابقہ نہیں پڑا تھا اور آنحضرتؐ نے ان نئے حالات اور حادثات کے سلسلہ میں کوئی بات نہیں بتائی تھی۔

قرآن و حدیث کے اصول و کلیات سے اس طرح کے نئے حالات و مسائل کا حکم کشف کرنا اور نکالنا بہت ہی پیچیدہ اور اختلاف انگیز ہے۔ اس سلسلہ میں تکمیل شریعت کا تقاضا یہ ہے کہ خاندان وحی سے وابستہ کوئی فرد ان نئے مسائل کا حکم قرآن و حدیث سے استنباط کرے یا ان کا حکم اس وہی علم کے ذریعہ بیان کرے جو آنحضرتؐ نے اس کے حوالے کیا ہے۔

اہل سنت معاشرہ کی ایک مشکل یہ بھی ہے کہ احکام سے متعلق قرآن کریم کی محدود آیات اور پیغمبر اکرم ﷺ کی چار سو حدیثوں سے ہی اسلام کے تمام احکام کا استنباط و استخراج کرنا چاہتے ہیں لیکن چونکہ بہت سے مواقع پر ناتوانی کا احساس کرتے ہیں اور مذکورہ بالا دلیلوں کو کافی نہیں پاتے لہذا قیاس و استحسان جن کی کوئی محکم اساس و بنیاد نہیں ہے، کا سہارا لے کر امت کی ضرورتوں کا حل تلاش کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ وہ خود جانتے ہیں کہ ایک مورد کا دوسرے مورد پر قیاس یا فقہی استحسان کے ذریعہ کسی مسئلہ کا حکم بیان کرنا کوئی صحیح بنیاد نہیں رکھتا۔ لیکن اگر امت میں کوئی ایسا اشارتہ و لائق شخص ہو جو اپنے وسیع علم کے ساتھ اس قسم کے مسائل کا حکم ایک خاص طریقہ سے پیغمبر اکرم ﷺ سے حاصل کر کے امت کے حوالے کرے اور گمان و شک پر عمل کی اس بے سرو سامانی کا خاتمہ کر دے تو یہ روش شریعت کی تکمیل اور لوگوں کے حقیقت تک پہنچنے کی راہ میں زیادہ موثر ثابت ہوگی۔

پھر بھی گنتی کے چند نامدرموارد میں قیاس و استحسان کی ضرورت پیش آئی تو ہم یہ کہہ سکتے ہیں

کہ ان جزئی موارد میں اسلام نے آسانی کے لئے ان پر عمل کرنے کی اجازت دے دی ہے۔ لیکن اگر شریعت کے پورے پیکر کو ظن و گمان پر استوار کریں اور ایسے قوانین دنیا کے حوالے کریں جن کی بنیاد حدس و گمان اور استحسان اور ایک مورد کا دوسرے مورد پر قیاس ہو تو ایسی صورت میں ہم نے ایسے اسلامی احکام اور اسلام کا ایسا حقوقی و جزائی مکتب فکر اور اخلاقی نظام دنیا کے سامنے پیش کیا ہے جس کی اساس و بنیاد ہی ناہموار اور پھس پھسی ہے کیا ایسی صورت میں ہم یہ توقع رکھ سکتے ہیں کہ دنیا کے لوگ ایسے اسلام کے حقوقی و جزائی احکام پر عمل کریں گے جس کے بیشتر احکام وحی الہی سے دور کا بھی واسطہ نہیں رکھتے۔

خلفاء امت کی لاعلمی

تاریخ اسلامی امت کے حکام و خلفاء کی اسلامی اصول و فروع سے لاعلمی کے بہت سے واقعات اپنے دامن میں لئے ہوئے ہے۔ علمی محاسبات یہ تقاضا کرتے ہیں کہ امت کے درمیان ایک عالم و آگاہ امام و پیشوا کا وجود ضروری ہے جو اسلامی احکام کا محافظ اور ان کا خزانہ دار ہو اور مستقل الہی تعلیمات کو لوگوں تک پہنچاتا رہے۔ ہم یہاں پر خلفاء کی لاعلمی اور اسلام کے بنیادی احکام سے ان کی جہالت کے چند نمونے پیش کرتے ہیں:

۱۔ حضرت عمر نے اصحاب کے مجمع میں ایک شوہر دار حاملہ عورت کو جو زنا کی مرتکب ہوئی تھی سنگسار کرنے کا حکم دیا لیکن آخر کار حضرت امیر المومنین علی علیہ السلام کی راہنمائی کے ذریعہ یہ حکم تبدیل کیا گیا۔ کیونکہ اگر یہ فرض کر لیا جائے کہ ماں نے گناہ کیا ہے تو وہ قصور وار ہے لیکن بچے نے کیا قصور کیا ہے جو ابھی اس کے رحم میں ہے؟

۲۔ خلیفہ نے ایک ایسے شادی شدہ شوہر کو جس کی بیوی دوسرے شہر میں رہتی تھی زنا کے جرم میں سنگسار کرنے کا حکم دیا۔ جبکہ ایسے شخص کے لئے جس کی بیوی اس سے دور ہو اللہ کا حکم سوتا زیا نہ (کوڑے) کی سزا ہے، سنگسار نہیں ہے۔ چنانچہ یہ حکم بھی حضرت علی علیہ السلام کے ذریعہ تبدیل کیا

گیا۔

۳۔ پانچ بدکار مردوں کو خلیفہ کے پاس لایا گیا اور گواہی دی گئی کہ یہ لوگ زنا کے مرتکب ہوئے ہیں۔ خلیفہ نے حکم دیا کہ سب کو ایک طرف سے سوسو کوڑے لگائے جائیں۔ امام علی علیہ السلام اس جگہ موجود تھے آپ نے فرمایا: ان میں سے ہر ایک کی سزا جدا جدا ہے۔ ایک کافر ذمی ہے، اس نے اپنے شرائط پر عمل نہیں کیا ہے۔ وہ قتل کیا جائے گا۔ دوسرا شادی شدہ مرد ہے جسے سنگسار کیا جائے گا۔ تیسرا جوان آزاد ہے اور غیر شادی شدہ ہے، اسے سوسو کوڑے لگائے جائیں گے۔ چوتھا غیر شادی شدہ غلام ہے، اسے آزاد کی آدمی سزا یعنی پچاس کوڑے لگائے جائیں گے، اور پانچواں شخص دیوانہ ہے، اسے چھوڑ دیا جائے گا۔

۴۔ حضرت ابو بکر کے زمانہ میں ایک مسلمان نے شراب پی لی تھی لیکن اس کا یہ دعویٰ تھا کہ وہ ایسے لوگوں میں زندگی بسر کرتا رہا ہے جو سب کے سب شراب پیتے تھے اور وہ نہیں جانتا تھا کہ اسلام میں شراب پینا حرام ہے۔ خلیفہ اور ان کے وزیر حضرت عمر نے ایک دوسرے کو حیرت سے دیکھا اور اس مشکل کو حل کرنے میں ناکام رہے آخر کار مجبور ہو کر انہوں نے حضرت علی علیہ السلام سے رجوع کیا۔ آپ نے فرمایا: اس شخص کو مہاجرین و انصار کے مجمع میں پھراؤ اگر ان میں سے کسی ایک شخص نے بھی یہ کہہ دیا کہ اس نے تحریم شراب کی آیت سے سنائی ہے تو اس پر حجت تمام ہے اور اس پر حد جاری ہوگی ورنہ اسے معذور سمجھ کر چھوڑ دیا جائے گا۔

۵۔ ایک شادی شدہ عورت کو زنا کے جرم میں گرفتار کیا گیا اور اسے سنگسار کرنے کا حکم صادر کیا گیا۔ امام علی علیہ السلام نے فرمایا: اس عورت سے مزید تحقیق کی جائے، شاید اس کے پاس اس جرم کا کوئی عذر موجود ہو۔ عورت کو دوبارہ عدالت میں پیش کیا گیا۔ اس نے اس جرم کے ارتکاب کی وجہ یوں بیان کی کہ میں اپنے شوہر کے اونٹوں کو چرانے صحرا لے گئی تھی۔ اس بیابان میں مجھ پر پیاس کا غلبہ ہوا میں نے وہاں موجود شخص سے بہت منت سماجت کی اور اس سے پانی مانگا لیکن وہ ہر بار یہ

کہتا تھا کہ تم میرے آگے تسلیم ہو جاؤ تو میں تمہیں پانی دوں گا۔ جب میں نے محسوس کیا کہ پیاس سے مر جاؤں گی تو میں مجبوراً اس کی شیطانی ہوس کے آگے تسلیم ہو گئی۔

اس وقت حضرت علیؓ نے تکبیر بلند کی اور فرمایا: ”اللہ اکبر فمن اضطرب غیر باغ و لا عا د فلا اثم علیہ“ یعنی اگر کوئی اضطراب اور مجبوری کی حالت میں کوئی غلط کام کرے تو اس پر کوئی گناہ نہیں ہے۔

اس طرح کے واقعات خلفاء کی تاریخ میں اس قدر زیادہ ہیں کہ ان پر ایک مستقل کتاب لکھی جاسکتی ہے۔ ان تمام حوادث کا حکم بیان کرنے کا ذمہ دار کون ہے۔ اس طرح کے حوادث بتغییر اکرمؓ کے زمانہ میں پیش نہیں آئے تھے کہ امت ان کا حکم مرکز وحی یعنی خود آنحضرتؐ سے حاصل کر لیتی۔ پھر آنحضرتؐ کی رحلت کے بعد اس قسم کے احکام بیان کرنے والا اور الہی احکام کا محافظ و خزانہ دار کے ہونا چاہئے۔ کیا یہ کہنا درست ہوگا کہ خداوند عالم نے ایسے حالات میں امت کو خود اس کے حال پر چھوڑ دیا ہے اور اپنے معنوی فیضان کو امت سے دور کر لیا ہے۔ چاہے امت کی نادانی و جہالت کی وجہ سے لوگوں کی ناموس خطرے میں پڑ جائے اور احکام حق کی جگہ باطل احکام لے لیں!۔

۱۔ اسلام کے فروعی احکام سے متعلق امت کے حکام اور خلفاء کی لامٹی کی ان رودادوں کی وضاحت کی ہمیں ضرورت نہیں ہے ان قضیوں کی تشریح تاریخ حدیث اور تفسیر کی کتابوں میں موجود ہے۔ علامہ امینی نے اپنی ”الفتاویٰ“ کی چھٹی جلد میں اور آٹھویں جلد میں خلفاء کی عملی لیاقت کے سلسلہ میں تفصیل سے گفتگو کی ہے۔ ثنائین مزید معلومات کے لئے اس کتاب کی طرف رجوع کریں۔

چوتھی فصل

پیغمبرِ امامت کو الہی منصب سمجھتے ہیں

اس میں کوئی کلام نہیں ہے کہ امت کی رہبری کا مسئلہ مسلمان معاشرہ کے لئے اساسی اور حیاتی حیثیت رکھتا ہے۔ چنانچہ اسی مسئلہ پر اختلاف پیدا ہوا اور اس نے امت کو دو حصوں میں تقسیم کر کے ان کے درمیان گہرا اختلاف پیدا کر دیا۔

اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ پیغمبرِ اکرم ﷺ نے تمام چیزوں کے بارے میں واجب، مستحب، حرام و مکروہ سے متعلق تو ساری باتیں بیان فرمائیں لیکن امت کی قیادت و رہبری اور حاکم کے خصوصیات سے متعلق کوئی بات کیوں بیان نہیں کی؟ کیا انسان یہ سوچ سکتا ہے کہ پیغمبرِ اکرم ﷺ نے اتنے اہم موضوع پر کوئی توجہ نہ دی ہوگی بلکہ خاموشی اختیار کی ہوگی اور امت کو بیدار نہ کیا ہوگا؟!

علمائے اہل سنت فرماتے ہیں کہ پیغمبرِ اکرم ﷺ نے قیادت و امامت کے طریقہ کے سلسلہ میں نفیاً و اثباتاً کوئی بات نہیں بیان کی اور یہ واضح نہیں کیا کہ قیادت و رہبری کا مسئلہ انتخابی ہے یا تعیناتی ہے۔

سچ مچ کیا عقل باور کرتی ہے کہ پیغمبرِ اکرم ﷺ نے اس انتہائی اہم اور حیاتی مسئلہ پر خاموشی اختیار کی ہوگی اور قضیہ کے ان دونوں پہلوؤں سے متعلق کوئی اشارہ نہ کیا ہوگا؟

عقل کے فیصلہ سے آگے بڑھ کر تاریخ اسلام کا جائزہ بھی اس نظریہ کے خلاف گواہی دیتا ہے۔ اور یہ بات صاف ظاہر ہوتی ہے کہ پیغمبر اسلام ﷺ نے مختلف موقعوں پر یہ یاد دہانی کی ہے کہ میرے بعد امت کی قیادت ورہبری کا مسئلہ خدا سے مربوط ہے اور وہ اس سلسلہ میں کوئی اختیار نہیں رکھتے۔ یہاں ہم تاریخ اسلام سے چند نمونے پیش کرتے ہیں:

جب مشرکوں کے ایک قبیلہ کے سردار ”افس“ نے اس شرط پر پیغمبر اسلام ﷺ کی حمایت کا اظہار کیا کہ اپنے کے بعد امت کی قیادت و سرپرستی آپ ہمارے حوالے کر جائیں گے تو پیغمبر اسلام نے اسے جواب دیا کہ ”الا امر الی اللہ یضعہ حیث یشاء“ یعنی امت کی قیادت کا مسئلہ خدا سے مربوط ہے وہ جسے بہتر سمجھے اس امر کے لئے منتخب کرے گا۔ قبیلہ کا سردار یہ بات سن کر مایوس ہو گیا اور اس نے آنحضرت ﷺ کے جواب میں کہا یا کہ یہ بات بالکل درست نہیں ہے کہ رنج و زحمت میں انھاؤں اور قیادت ورہبری کسی اور کو ملے!

تاریخ اسلام میں یہ واقعہ بھی ہے کہ پیغمبر اکرم ﷺ نے ”یمامہ“ کے حاکم کو خط لکھ کر اسے اسلام کی دعوت دی اس نے بھی ”افس“ کے مانند آنحضرت ﷺ سے آپ کی جانشینی کا تقاضا کیا تو آنحضرت نے اسے انکار میں جواب دیتے ہوئے فرمایا: ”لا ولا کسر امۃ“ یعنی یہ کام عزت نفس اور روح کی بلندی سے بعید ہے۔ ۲

امت کی قیادت ورہبری کا مسئلہ اتنا اہم ہے کہ اس کی اہمیت کو صرف ہم نے محسوس نہیں کیا ہے بلکہ صدر اسلام میں بھی یہ مسئلہ بہت سے لوگوں کی نظر میں بڑی اہمیت رکھتا تھا۔ مثلاً جس وقت خلیفہ دوم، ابولؤلؤ کی ضرب سے زخمی ہوئے اور ان کے بیٹے عبد اللہ بن عمر نے اپنے باپ کو مرتے ہوئے دیکھا تو اپنے باپ سے کہا جتنی جلدی ہو سکے اپنا ایک جانشین معین کیجئے اور امت

۱۔ تاریخ طبری، ج ۲، ص ۱۷۲

۲۔ تاریخ کامل، ج ۲، ص ۶۳

محمدی گو بے حاکم و بے سرپرست نہ چھوڑئے۔

بالکل یہی پیغام ام المؤمنین عائشہ نے بھی خلیفہ دوم کو کہلایا اور ان سے درخواست کی کہ امت محمدی کے لئے ایک محافظ و نگہبان معین کر جائیں۔ اب کیا یہ کہنا صحیح ہوگا کہ ان دو شخصیتوں نے امت کی قیادت و رہبری کے مسئلہ کی اہمیت کو تو اچھی طرح محسوس کر لیا تھا لیکن رسول اسلام ﷺ ان دو افراد کے بقدر بھی اس مسئلہ کی اہمیت کو سمجھ نہیں پائے تھے؟!

پیغمبر اسلام ﷺ کی مدینہ کی دس سالہ زندگی کا ایک ہلکا سا جائزہ لینے کے ساتھ ہی یہ بات پوری طرح ثابت ہو جاتی ہے کہ آنحضرتؐ جب بھی کہیں جانے کے لئے مدینہ سے نکلتے تھے کسی نہ کسی کو مدینہ میں اپنا جانشین معین کر جاتے تھے، تاکہ اس مختصر مدت میں بھی جب پیغمبر اکرم ﷺ مدینہ میں تشریف نہیں رکھتے لوگ بے سرپرست اور بے پناہ نہ رہیں۔ کیا یہ بہتر ہے کہ جو جانشین معین کرنے کی اہمیت سے آگاہ ہو اور یہ جانتا ہو کہ حتیٰ مختصر مدت کے لئے بھی جانشین معین کئے بغیر مدینہ کو ترک نہیں کرنا چاہئے۔ وہ دنیا کو ترک کرے اور اپنا کوئی جانشین معین نہ کرے یا کم از کم قیادت و رہبری کی شکل و نوعیت اور حاکمیت کے طریقہ کار کے بارے میں کچھ نہ کہے؟!

پیغمبر اسلام ﷺ جب کسی علاقہ کو فتح بھی کرتے تھے تو اسے ترک کرنے سے پہلے وہاں ایک حاکم معین فرماتے تھے پھر ان حالات میں یہ کیسے کہا جاسکتا ہے کہ پیغمبر اسلام ﷺ نے اپنا جانشین معین کرنے میں غفلت سے کام لیا ہوگا اور اس کے لئے میں کوئی فکر نہ کی ہوگی، جو ان کے بعد امت کی قیادت و رہبری اپنے ہاتھ میں لے سکے اور اسلام کے نوا درخت کی نگہبانی و سرپرستی کر سکے؟!

نبوت و امامت باہم ہیں

متواتر احادیث اور اسلام کی قطعی تاریخ صاف گواہی دیتی ہیں کہ نبوت اور امامت دونوں کا اعلان ایک ہی دن ہوا اور جس روز پیغمبر اکرم ﷺ خدا کی طرف سے اپنے خاندان والوں کے

درمیان اپنی رسالت کا اعلان کرنے پر مامور ہوئے تھے اسی روز آپؐ نے اپنا خلیفہ و جانشین بھی معین فرما دیا تھا۔

اسلام کے گرانقدر مفسرین و محدثین لکھتے ہیں کہ جب آیت ”و انذر عشیرتک الاقربین“ (شعراء/۲۱۴) نازل ہوئی تو پیغمبر اکرم ﷺ نے حضرت علی علیہ السلام کو خاندان والوں کے لئے کھانا تیار کرنے کا حکم دیا جنھیں آنحضرتؐ نے مہمان بلایا تھا۔ حضرت علی علیہ السلام نے بھی پیغمبر ﷺ کے حکم سے کھانا تیار کیا اور بنی ہاشم کی پینتالیس شخصیتیں اس مجلس میں اکٹھا ہوئیں۔ پہلے روز ابولہب کی بیہودہ باتوں کی وجہ سے پیغمبر اکرم ﷺ اپنی رسالت کا پیغام سنانے میں کامیاب نہیں ہوئے۔ دوسرے روز پھر یہ دعوت کی گئی اور مہمانوں کے کھانا کھالینے کے بعد پیغمبر ﷺ اپنی جگہ کھڑے ہوئے اور خداوند عالم کی حمد و ثنا کرنے کے بعد فرمایا:

میں تم لوگوں اور دنیا کے تمام انسانوں کے لئے خدا کا پیغامبر ہوں اور تم لوگوں کے لئے دنیا و آخرت کی بھلائی لایا ہوں۔ خدا نے مجھے حکم دیا ہے کہ میں تم لوگوں کو اس دین کی طرف دعوت دوں تم میں سے جو شخص اس کام میں میری مدد کرے گا وہ میرا وصی اور جانشین ہوگا۔

اس وقت حضرت علی بن ابیطالب رضی اللہ عنہ کے علاوہ کسی نے بھی اٹھ کر پیغمبر ﷺ کی نصرت و مدد کا اعلان نہیں کیا۔ پیغمبر اکرم ﷺ نے حضرت علی علیہ السلام کو بیٹھ جانے کا حکم دیا اور دوبارہ اور تیسری بار بھی اپنا جملہ دہرایا اور ہر بار حضرت علی رضی اللہ عنہ کے علاوہ کسی نے آپؐ کی حمایت اور اس راہ میں آپؐ کی نصرت و فداکاری کا اظہار نہیں کیا۔ اس وقت پیغمبر ﷺ نے اپنے خاندان والوں کی طرف رخ کر کے فرمایا: ”ان هذا اخی و وصی و خلیفتی فیکم فاسمعوا و

اطیعوا“ یعنی علیؑ اور تمہارے درمیان میرا وحی و جانشین ہے، پس تم پر لازم ہے کہ اس کا فرمان سنو اور اس کی اطاعت کرو۔ اے

تاریخ کا یہ واقعہ اس قدر مسلم ہے کہ ابن تیمیہ جس کا خاندان اہل بیت سے عناد سب پر ظاہر ہے، کے علاوہ کسی نے بھی اس کی صحت سے انکار نہیں کیا ہے۔ یہ حدیث حضرت علیؑ کی امامت کی دلیل ہونے کے علاوہ اس بات کی سب سے اہم گواہ ہے کہ امامت کا مسئلہ امت کے اختیار میں نہیں ہے۔ اس سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ جانشین کا اعلان اس قدر اہم تھا کہ نبوت و امامت دونوں منصبوں کے مالک افراد کا اعلان ایک ہی دن پیغمبر ﷺ کے خاندان والوں کے سامنے کیا گیا۔

یہ واقعہ تین بعثت کو پیش آیا اور اس وقت تک پیغمبر اکرم ﷺ کی دعوت مخصوص افراد کے ذریعہ لوگوں تک پہنچائی جاتی تھی اور تقریباً ۵۰ پچاس افراد اس وقت تک مسلمان ہوئے تھے۔

اسلامی قوانین اور کتاب خدا معصوم کی تفسیر سے بے نیاز نہیں

اسلامی قوانین چاہے جتنے بھی روشن و واضح ہوں پھر بھی ان کی توضیح و تفسیر ضروری ہے بالکل یوں ہی جیسے آج ملکوں کے قوانین چاہے جس قدر روزمرہ کی زبان میں تنظیم کئے جائیں پھر بھی ان کی وضاحت کے لئے زبردست قسم کے ماہروں کی ضرورت ہوتی ہے جو ان کے اہم پہلوؤں کو واضح کر سکیں۔ اور اسلامی قوانین بھی حتیٰ وہ بھی جو پیغمبر اکرم ﷺ کی زبان سے نقل ہوئے ہیں توضیح و تفسیر سے مستثنیٰ اور بے نیاز نہیں ہیں۔ اس کے گواہ مسلمانوں کے درمیان وہ سیکڑوں اختلافات ہیں جو قرآنی آیات اور اسلامی احادیث کے سلسلہ میں نظر آتے ہیں۔

کیا اسلام کے ابدی و جاودانی قوانین کو ایسے کسی پیشوا کی ضرورت نہیں ہے جو پیغمبر اکرم کے علوم کا وارث ہو اور اختلاف کے موارد میں سب کے لئے حجت ہو؟ اور کیا اختلافات دور کرنے کے فاصلوں کو کم کرنے اور اسلامی اتحاد برقرار کرنے کے لئے ایسے جانشین کا تعین لازم و ضروری نہیں تھا؟

حضرت عمر کی خلافت کے دوران ایک شخص نے اسلامی عدالت میں شکایت کی کہ میری بیوی کے یہاں چھ ہی مہینہ میں بچہ پیدا ہو گیا ہے۔ قاضی نے حکم دے دیا کہ لے جاؤ اس عورت کو

سنگسار کر دو۔ راستہ میں اس عورت کی نگاہ حضرت علی علیہ السلام پر پڑی اس نے چیخ کر کہا: اے ابو الحسن میری فریاد کو پہنچئے۔ میں ایک پاک دامن عورت ہوں اور میں نے اپنے شوہر کے علاوہ کسی سے قربت نہیں کی ہے۔ حضرت علی علیہ السلام جب واقعہ سے آگاہ ہوئے تو انھیں یہ سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ قاضی نے فیصلہ کرنے میں غلطی کی ہے۔ آپ نے ماموروں سے مسجد واپس چلنے کو کہا اور مسجد میں جا کر خلیفہ سے پوچھا کہ تم نے یہ کیسا فیصلہ کیا ہے؟ خلیفہ نے کہا کہ شوہر سے اس عورت کی قربت کو صرف چھ ماہ گزرے ہیں۔ کیا کہیں چھ مہینے میں بچہ پیدا ہوتا ہے؟ حضرت علی علیہ السلام نے فرمایا: کیا تم نے قرآن نہیں پڑھا جس میں آیا ہے ”وَحَمْلُهُ وَفِصَالُهُ ثَلَاثُونَ شَهْرًا“ یعنی اس کا حمل اور دودھ پلانے کا زمانہ تیس ماہ ہے۔ خلیفہ نے جواب دیا درست ہے۔ پھر حضرت علی ؑ نے فرمایا: کیا قرآن نے دودھ پلانے کا زمانہ دو سال نہیں معین کیا ہے کہ ارشاد ہوتا ہے: ”

وَالْوَالِدَاتُ يُرْضِعْنَ أَوْلَادَهُنَّ حَوْلَيْنِ كَامِلَيْنِ“ ۲ یعنی مائیں اپنے بچوں کو پورے دو سال دودھ پلائیں۔ خلیفہ نے جواب دیا: سچ فرمایا: اس پر حضرت علی ؑ نے فرمایا: کہ اگر دودھ پلانے کے چوبیس مہینوں کو تیس مہینوں سے کم کرو تو چھ ہی ماہ باقی رہتے ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حاملگی کی کم سے کم مدت چھ ماہ ہے اور عورت اس مدت میں سالم بچہ پیدا کر سکتی ہے۔

حضرت امیر المؤمنین علی ؑ نے دو آیتوں کو باہم ضمیر کر کے ایسا قرآنی حکم استنباط کیا جس سے اصحاب واقف نہیں تھے اب کیا یہ کہا جاسکتا ہے کہ پیغمبر اسلام ﷺ نے اس الہی کتاب قرآن مجید کی وضاحت کے لئے جو ایک جاوید رہنما اور ابدی قانون کی حیثیت رکھتی ہے اپنے بعد کوئی اقدام نہیں فرمایا ہے؟

ممکن ہے یہ کہا جائے کہ ایسے نادر مسئلہ میں اختلاف سے جو انسانی زندگی میں بہت کم پیش

۱۔ سورہ احقاف ۱۵

۲۔ سورہ بقرہ ۲۳۲

آتا ہے پورے اسلامی معاشرہ کے اتحاد کو خطرہ لاحق نہیں ہو سکتا، تو اس کے جواب میں یہ کہا جائے گا کہ اختلاف اس طرح کے نادر مسائل سے مخصوص نہیں ہے بلکہ یہ اختلاف مسلمانوں کے روزمرہ اور بنیادی فرائض و وظائف سے بھی تعلق رکھتا ہے اور ظاہر ہے کہ ہر روز کے مسائل میں مسلمانوں کے اختلاف و تفرقہ سے آنکھیں بند نہیں کی جا سکتیں اور یہ تصور نہیں کیا جا سکتا کہ اتنے سارے مسائل میں اختلافات سے مسلمانوں کے اتحاد و یکجہتی پر کوئی ضرب نہیں پڑتی ہے۔

قرآن مجید نے اپنے سورہ مائدہ آیت ۶ میں وضو کرنے کی کیفیت مسلمانوں سے بیان کی ہے اور صدر اسلام میں مسلمان ہر روز اپنی آنکھوں سے پیغمبر اسلام ﷺ کو وضو کرتے ہوئے دیکھتے تھے، لیکن پیغمبر اسلام ﷺ کی رحلت کے بعد قرآن مجید دنیا کے دور دراز کے علاقوں میں پھیلا اور علماء کے اوپر قرآنی آیات میں اجتہاد و تفکر کا دروازہ کھلا اور فقہی احکام سے متعلق آیات پر رفتہ رفتہ بحث و تحقیق ہوئی لیکن سرانجام کیفیت وضو سے متعلق آیت کو سمجھنے میں اختلاف پیدا ہو گیا اور آج یہ اختلاف باقی اور رائج ہے کیوں کہ شیعہ علماء اپنے ہاتھوں کو اوپر سے نیچے کی طرف دھوتے ہیں اور پیروں کا مسح کرتے ہیں لیکن علمائے اہل سنت ان کے بالکل برخلاف عمل کرتے ہیں۔

اگر امت کے درمیان ایک ایسا معصوم اور تمام اصول و فروع سے آگاہ رہبر موجود ہو کہ سب کے سب اس کی بات تسلیم اور اس کی پیروی کرتے ہوں تو ہرگز ایسا اختلاف جو مسلمانوں کو دو حصوں میں تقسیم کر دے پیش نہیں آئے گا اور پورا اسلامی معاشرہ اپنے روزمرہ کے فرائض کی انجام دہی میں یک رنگ و یک شکل ہوگا۔

قرآن کی تفسیر میں اختلاف

اسلام کے جزا و سزا کے قوانین میں ایک چور کے ہاتھ کاٹنے کا قانون ہے جو اپنے شرانگہ و خصوصیات کے ساتھ فقہی کتابوں میں درج ہے ابھی ابھی دو تین صدی پہلے تک جبکہ اسلام ایک طاقت کی شکل میں حاکم تھا اسلامی حکومتیں اپنے قوانین قرآن سے حاصل کرتی تھیں اور جبکہ مغربی

تو انہیں ابھی اسلامی سرزمینوں تک نہیں پہنچے تھے چور کی تہا سزا اس کا ہاتھ کاٹنا تھی۔ لیکن افسوس کہ یہ ایک چھوٹا سا اور تقریباً روزمرہ کا مورد بھی ان موارد میں سے ہے کہ اسلام کی چودہ صدیاں گزرنے کے بعد بھی اس کی حد معین کرنے کے سلسلہ میں ایک نقطہ پر متحد نہیں ہو سکے۔

معتصم عباسی کے زمانہ میں جبکہ ہجرت پیغمبر اکرم ﷺ کو دو سو سال سے زیادہ گزر چکے تھے، علماء نے اسلام کے درمیان ہاتھ کاٹنے سے متعلق آیت کی تفسیر میں اختلاف پیدا ہو گیا۔ وہ لوگ یہ طے نہیں کر پارے تھے کہ چور کا ہاتھ کہاں سے کاٹنا چاہئے۔ ایک کہتا تھا: ہاتھ کلائی سے کاٹا جائے گا۔ دوسرا کہتا تھا: ہاتھ کہنی سے کاٹا جائے گا۔ تیسرا کہتا تھا:..... آخر کار خلیفہ وقت نے شیعوں کے نویں امام حضرت امام محمد تقی علیہ السلام سے بھی دریافت کیا۔ آپ نے فرمایا: چور کے ہاتھ کی صرف چار انگلیاں کاٹی جائیں گی۔ جب آپ سے پوچھا گیا کہ اس کی دلیل کیا ہے تو آپ نے فرمایا کہ خداوند عالم قرآن مجید میں فرمایا ہے: ”و ان المساجد اللہ“ سجدہ کی جگہیں خدا کے لئے ہیں اور اس سے متعلق ہیں۔ آپ نے فرمایا: ان میں سے ایک ہتھیلی بھی ہے جسے سجدہ کے وقت زمین پر ٹکانا ضروری ہے اور جو چیز خدا سے متعلق ہو اسے کاٹنا نہیں جاسکتا۔

اگر امت کے درمیان ایک ایسا قرآن شناس موجود ہو جو قرآن کے اسرار و رموز سے پوری طرح آگاہی رکھتا ہو اور فکری اعتبار سے مسلمانوں کا بجا و مرکز قرار پائے اور تمام مسلمان اس کی طرف رجوع کریں تو ظاہر ہے کہ بہت سے اختلافات آسانی سے دور ہو جائیں گے اور امت ایک ہی سمت میں ایک ہی مقصد کے ساتھ قدم بڑھائے گی۔ نہ مسلمانوں کا قیمتی وقت ضائع ہوگا اور نہ ان میں خطرناک اور خونریز اختلاف ٹکراؤ پایا جائے گا۔

قرآن مجید ہر طرح کے استنباط اور صحیح اسلام کو سمجھنے کے لئے اساسی و بنیادی ماخذ ہے اور کوئی چیز اس عظیم کتاب کی برابری نہیں کر سکتی۔ اگر دوسرے ماخذ میں باہم اختلاف نظر آئے مثلاً اگر پیغمبر اکرم کی دو حدیثیں باہم ٹکرائیں کھتی ہوں تو ہم اس حدیث کو اپنائیں گے جو قرآن کے مطابق

ہوگی۔

لیکن کیا دلالت اور بیان کے اعتبار سے قرآن کی تمام آیتیں ایک جیسی ہیں اور کیا قرآن میں سرے سے کوئی ایسی آیت ہے ہی نہیں جس کے لئے کسی معصوم مفسر کی ضرورت ہو؟ یہ دعویٰ وہی کر سکتا ہے جو قرآن سے زیادہ لگاؤ نہیں رکھتا اور اس کی روح و فکر قرآن سے ہم آہنگ نہیں ہے۔ صحیح ہے کہ قرآن کی بہت سی آیتیں دلالت کے اعتبار سے روشن و واضح ہیں اور اس کی محکم آیات میں شمار ہوتی ہیں اور وہ قرآنی آیات بھی جو مبہم ہیں دوسری آیتوں کے ذریعہ روشن و واضح ہو جاتی ہیں۔ اس کے باوجود قرآن میں ایسی آیتیں موجود ہیں جو یا نزول کے وقت سے ہی مبہم ہیں یا زمانہ وحی سے دوری کی وجہ سے مبہم ہو گئی ہیں۔ اس قسم کی آیات چاہے ان کی تعداد کم ہی کیوں نہ ہو کیسے حل کی جاسکتی ہیں؟

کیا امت کے درمیان کوئی ایسی مرکزی شخصیت موجود نہیں ہونی چاہئے جو اس قسم کی آیات کا ابہام دور کر کے ان کی صحیح تفسیر کر سکے جن میں سے بعض کے نمونے آپ اوپر ملاحظہ کر چکے ہیں؟ حضرت علی علیہ السلام نے جب ابن عباس کو خوارج سے مناظرہ کے لئے روانہ کیا تو انھیں یہ حکم دیا تھا کہ: "لا تخاصمہم بالقرآن فان القرآن حمال ذو وجوہ تقول و یقولون" یعنی ان سے ہرگز قرآن سے بحث و مباحثہ نہ کرنا، کیوں کہ قرآن کی آیاتیں کئی احتمالات اور کئی معانی رکھتی ہیں۔ تم ان سے بعض آیات سے استدلال کرو گے اور وہ تمہیں بعض دوسری آیات سے جواب دیں گے۔ یہ مسلم ہے کہ امام کی یہ گفتگو قرآن کی تمام آیات سے متعلق نہیں تھی بلکہ آپ کی گفتگو ان آیات سے متعلق تھی جو دو پہلو والی ہیں، بظاہر روشن و واضح نہیں ہیں اور ان کا مفہوم و مفاد قطعی نہیں ہے۔ اس اعتبار سے امت کے درمیان ایک امام معصوم کا وجود جو اسلام کے اصول و فروع سے

۱۔ حضرت امیر المومنین علیؑ اس قسم کی آیات کے بارے میں فرماتے ہیں: "کتاب اللہ تبصرون بہ، و تسمعون بہ و

پوری طرح آگاہ ہو، قرآن کریم کے علوم پر کامل تسلط رکھتا ہو اور امت کے درمیان ایک علمی و فکری پناہ گاہ ہو۔ اختلافات دور کرے اور اس کی بات فیصلہ کن ہو، لازم و ضروری ہے ورنہ دوسری صورت میں اختلافات بڑھتے جائیں گے بلکہ بعض احکام اور قرآنی آیات کی تفسیر غلط کی جائے گی جو مسلمانوں کے قرآنی حقائق سے دور ہو جانے کا باعث ہوگی۔

ہشام ابن حکم

ہشام، امام جعفر صادق علیہ السلام کے زبردست شاگرد اور دوسری صدی ہجری میں علم مناظرہ اور علم کلام کے استاد تھے انھوں نے امت کے درمیان اختلاف دور کرنے اور صحیح فیصلہ کے لئے امام کے وجود کی ضرورت پر روشنی ڈالی ہے کہ آپ نے ایک روز فرقہ معترزلہ کے سردار اور بصرہ کے پیشوا عمرو بن عبید سے امت کے درمیان امام معصوم کے وجود کی ضرورت پر بحث کی شروع اور اس سے درخواست کی کہ میرے سوالوں کے جواب دو۔ عمرو بن عبید نے بھی قبول کیا۔ ہشام نے پوچھا:

تمہارے آنکھ ہے؟

ہاں

اس سے کہا کام لیتے ہو؟

اس سے لوگوں اور چیزوں کو دیکھتا ہوں اور رنگوں کی تشخیص دیتا ہوں۔

تمہارے کان ہے؟

ہاں؟

اس سے کیا کام لیتے ہو؟

اس سے آواز سنتا ہوں۔

تمہارے ناک ہے؟

ہاں۔

اس سے کیا کام لیتے ہو؟

اس سے بوسوگھٹنا ہوں۔

اس کے بعد ہشام نے دوسرے حواس یعنی قوت ذائقہ و لامسہ اور بدن کے دوسرے اعضاء مثلاً انسان کے جسم میں ہاتھ اور پاؤں وغیرہ کے بارے میں سوال کیا اور عمرو بن عبید نے ان سب کا صحیح جواب دیا۔ پھر ہشام نے پوچھا: تمہارے دل ہے؟ ہاں۔ انسان کے بدن میں اس کا کیا کام ہے؟ عمرو نے جواب دیا کہ جو کچھ بدن کے تمام اعضاء و جوارح انجام دیتے ہیں قلب کے ذریعہ انہیں تشخیص دیتا ہوں۔ اور جب بھی انسانی حواس میں سے کوئی خطا کرتا ہے یا بدن کا کوئی حصہ شک میں مبتلا ہوتا ہے تو قلب و دل کی طرف رجوع کرتا ہے اور اپنے شک کو دور کر دیتا ہے۔

اس وقت ہشام نے اس بحث سے نتیجہ حاصل کرتے ہوئے کہا کہ جس خدا نے جسم کے حواس اور اعضاء کی شک و تردید دور کرنے کے لئے بدن میں ایک ایسی پناہ گاہ اور مرکزی چیز پیدا کی ہے کیا یہ ممکن ہے کہ انسانی معاشرہ کو یوں ہی اس کے حال پر چھوڑ دے اور اس کے لئے کوئی پیشوا و رہبر معین نہ کرے کہ انسانی معاشرہ اپنے شک، تیرانی اور خطا کو اس کے ذریعہ دور کرے اور صحیح راہ اختیار کر سکے! ۱

امام جعفر صادق علیہ السلام، جانشین پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے مرتبہ اور اس کی حیثیت کو یوں بیان فرماتے ہیں: پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی رحلت کے بعد ایسے امام کا وجود لازم و ضروری ہے جو الہی احکام کو ہر طرح کی گزند اور کمی و زیادتی سے محفوظ رکھے اور ان کی حفاظت کرے۔ ۲ ہشام ابن حکم نے ایک روز حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام کی موجودگی میں شام کے ایک عالم سے مناظرہ کیا اور اس

۱۔ اصول کافی، ج ۱ ص ۷۰

۲۔ اصول کافی، ج ۱ ص ۷۲

تفصیلی مناظرہ کے دوران اس سے پوچھا کہ کیا خداوند عالم نے پیغمبر اکرم ﷺ کی رحلت کے بعد مسلمانوں کے درمیان ہر طرح کے اختلافات دور کرنے کے لئے کوئی دلیل و حجت ان کے حوالے کی ہے؟ اس نے کہا: ہاں اور وہ دلیل و حجت قرآن کریم اور پیغمبر اکرم ﷺ کی سنت یعنی ان کی احادیث ہیں۔ ہشام نے پوچھا: کیا قرآن و احادیث اختلافات دور کرنے کے لئے کافی ہیں۔ اس نے جواب دیا ہاں۔ تو ہشام نے کہا اگر کافی ہیں تو پھر ہم دونوں جو ایک مذہب رکھتے ہیں اور ایک ہی درخت کی شاخیں ہیں آپس میں اختلاف کیوں رکھتے ہیں؟ اور ہم میں سے ہر ایک نے ایسی راہ کیوں اختیار کر رکھی ہے جو دوسرے کے خلاف ہے؟ اس پر اس شامی عالم کو خاموشی اختیار کرنے اور حقانیت کا اعتراف کرنے کے علاوہ کوئی چارہ نظر نہ آیا۔!

خطرناک مثلث اسلام کے تین دشمن

جس وقت پیغمبر اکرم ﷺ نے دنیا سے رحلت فرمائی تو اسلام کے اس نوجوان وجود کو باہر اور اندر سے تین طرح کے دشمن گھیرے ہوئے تھے اور ہر لمحہ اس کو خطرہ تھا کہ یہ تینوں طاقتیں باہم ایک ہو کر ایک مثلث بنا لیں اور اسلام پر حملہ آور ہوں۔

پہلا دشمن:

داخلی دشمن یعنی مدینہ اور اس کے آس پاس کے منافقین تھے جنہوں نے کئی بار پیغمبر اکرم کی جان لینے کی کوشش کی تھیں اور جنگ تبوک سے واپسی کے وقت ایک خاص منصوبہ کے تحت جو پورے طور سے تاریخ میں ذکر ہو ہے، پیغمبر اکرم کے اونٹ کو بھڑکا کر پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی جان لینا چاہتے تھے۔

پیغمبر اکرم ﷺ نے ان لوگوں کی سازش سے آگاہ ہو کر وہ تدبیر اپنائی کہ ان کا منصوبہ ناکام ہو گیا۔ ساتھ ہی اسلام کی عمومی مصلحتوں کو مد نظر رکھتے ہوئے آنحضرتؐ نے اپنی زندگی میں ہی ان کے نام بعض خاص افراد مثلاً ”حذیفہ یمانی“ کو بتا دیئے تھے۔

اسلام کے یہ دشمن جو بظاہر مسلمانوں کے لباس میں چھپے ہوئے تھے، آنحضرتؐ کی موت کا

انتظار کر رہے تھے اور درحقیقت اس آیت کو اپنے دل میں دہرا رہے تھے جسے قرآن پیغمبر کی حیات میں کافروں کی زبانی نقل کرتا ہے: "انما نטר بص به ریب المنون"۔ یعنی ہم اس کی موت کا انتظار کر رہے ہیں کہ وہ فوت ہو جائے اور اس کی شہرت ختم ہو جائے۔

یہ لوگ یہ سوچ رہے تھے کہ پیغمبر اسلام ﷺ کی رحلت کے ساتھ ہی اسلام کی رونق ختم ہو جائے گی، اس کا پھیلاؤ رک جائے گا۔ کچھ لوگ یہ بھی سوچتے تھے کہ اسلام آنحضرتؐ کے بعد کمزور پڑ جائے گا اور وہ دوبارہ زمانہ جاہلیت کے عقائد کی طرف پلٹ جائیں گے۔

آنحضرتؐ کی رحلت کے بعد "ابوسفیان" نے چاہا کہ قریش اور بنی ہاشم کے درمیان اختلاف پیدا کر دے اور جنگ بھڑکا کر اسلامی اتحاد کے اوپر کاری ضرب لگائے اس مقصد کے پیش نظر وہ بڑے ہمدردانہ انداز میں حضرت علیؑ کے گھر میں داخل ہوا اور ان سے بولا: اپنا ہاتھ بڑھائیے کہ میں آپ کی بیعت کروں تاکہ تمہیں اور عدی قبیلوں کے لوگ آپ کی مخالفت کی جرأت نہ کریں۔ امام نے پوری ہوشیاری کے ساتھ صف اسلام میں اختلاف پیدا کرنے اور مسلمانوں کو آپس میں ٹکرانے کی اس کی سازش کو سمجھ لیا لہذا فوراً ان کا سا جواب دیا اور خود پیغمبر اکرم ﷺ کی تجسیم و تکلیفین میں مشغول ہو گئے۔ ۲

مسجد ضرار جونویں ہجری میں بنائی گئی تھی اور پیغمبر اسلام ﷺ کے حکم سے عمار یا سر کے ہاتھوں منہدم کی گئی تھی پیغمبر اسلام ﷺ کی حیات کے آخری دنوں میں منافقوں کی خفیہ سازشوں کا ایک نمونہ تھی اور دشمن خدا (ابن عامر) سے ان کے تعلقات کو ظاہر کرتی تھی ابن عامر وہ شخص ہے جو فتح

۱۔ سورہ طور: ۳

۲۔ الدرجات الرفیعہ ص ۷۷ حضرت علیؑ نے اس موقع پر ابوسفیان سے اپنا وہ تاریخی جملہ ارشاد فرمایا: "ما زلت علی و

مکہ کے بعد روم بھاگ گیا اور وہاں سے اپنے گروہ کی ہدایت و رہنمائی کیا کرتا تھا۔ ہجرت کے نویں سال جب پیغمبر اکرم ﷺ جنگ تبوک پر جانے کے لئے مدینہ سے نکلے تو داخلی سطح پر منافقوں کے ممکنہ فساد و سازش کے خطرہ سے بہت زیادہ پریشان تھے۔ اسی لئے آپؐ نے حضرت علیؑ کو مدینہ میں اپنا جانشین مقرر کیا تھا اور آپؐ کے لئے وہ تاریخی جملہ فرمایا تھا "انت منی بمنزلۃ ہارون من موسیٰ" یعنی اے علیؑ تم کو مجھ سے وہی نسبت ہے جو ہارون کو موسیٰ سے تھی۔ اس کے بعد آپؐ نے ان سے تاکید کی کہ داخلی سطح پر مدینہ میں سکون و آرام برقرار رکھنے اور فتنہ و فساد کی روک تھام کے لئے مدینہ میں ہی رہو۔

منافقوں اور ان کی خطرناک سازشوں سے متعلق بہت سی آیتیں قرآن کریم کے مختلف سوروں میں موجود ہیں اور سب کی سب اسلام سے ان کی دیرینہ عداوت کو بیان کرتی ہیں۔ اور ابھی یہ فساد کی مدینہ میں موجود ہی تھے کہ آنحضرتؐ نے دنیا سے رحلت فرمائی۔

پیغمبر اسلام ﷺ کی رحلت کے بعد قبائل عرب میں ایک گروہ ایسا بھی تھا جو آپؐ کے بعد کفر و شرک کی طرف پلٹ گئے اور ماموران زکوٰۃ کو باہر نکال کر انہوں نے اسلام کے خلاف بغاوت کا اعلان کر دیا۔ یہ لوگ اگرچہ منافق نہیں تھے، لیکن ایمان کے اعتبار سے اتنے کمزور تھے جو پت جھڑ کے پتوں کی طرح ہر رخ کی ہوا پر ادھر ادھر ہی اڑنے لگتے تھے۔ اگر انہیں کفر و شرک کا ماحول مناسب لگتا تو اسلام کو چھوڑ کر کفر کی راہ اختیار کر لیتے تھے۔

ایسے خونخوار دشمنوں کے ہوتے ہوئے جو اسلام کی کمین میں بیٹھے تھے اور اسلام کے خلاف سازش و شورش میں مشغول تھے کیا یہ ممکن تھا کہ ایسے عاقل، سمجھدار اور دور اندیش پیغمبر اسلام ﷺ ان ناگوار حوادث کی روک تھام کے لئے اپنا کوئی جانشین مقرر نہ کریں اور امت و اسلام کو دشمنوں کے درمیان اس طرح حیران و سرگردان چھوڑ جائیں کہ ہر گروہ یہ کہتا نظر آئے

کہ ”منا امیر منا امیر“ یعنی یہ کہے کہ امیر ہم میں سے ہونا چاہئے اور وہ کہے کہ امیر ہم میں سے ہونا چاہئے!؟

باقی دو دشمن

اس مثلث کے بقیہ دو دشمن اس وقت کی ایران و روم کی دو بڑی طاقتیں تھیں۔ روم کی فوج سے اسلام کی پہلی جنگ ہجرت کے آٹھویں سال فلسطین میں ہوئی جو لشکر اسلام کے بڑے بڑے سرداروں ”جعفر طیار“، ”زید بن حارث“ اور ”عبداللہ بن رواحہ“ کے قتل اور لشکر اسلام کی انتہائی سخت شکست پر تمام ہوئی اور لشکر اسلام خالد بن ولید کی سرداری میں مدینہ واپس آیا۔ کفر کی فوج سے لشکر اسلام کی اتنی سخت شکست سے قیصر روم کے حوصلے بلند تھے اور ہر لمحہ یہ خطرہ تھا کہ کہیں وہ لوگ مرکز اسلام پر حملہ نہ کریں اسی وجہ سے آنحضرت ﷺ ہجرت کے نویں سال ایک بڑا لشکر جس کی تعداد تیس ہزار تھی لیکر شام کی طرف روانہ ہوئے تاکہ فوجی مشق کے علاوہ دشمن کے ممکنہ حملہ کو روک سکیں اور راہ کے بعض قبائل سے تعاون یا غیر جانبداری کا عہد و پیمان لے سکیں۔ اس سفر میں جس میں آنحضرت ﷺ کو مسلسل رنج و زحمت اٹھانا پڑی آپ رومیوں سے لڑے بغیر مدینہ واپس آ گئے۔

اس کامیابی نے پیغمبر اکرم ﷺ کو مطمئن نہیں کیا آپ لشکر اسلام کی شکست کے جبران کی کوشش میں لگے رہے۔ اس کے لئے آپ نے اپنی بیماری سے چند روز پہلے ”اسامہ بن زید“ کو لشکر اسلام کا علم دے کر اپنے ساتھیوں کو حکم دیا کہ اسامہ کی سرداری میں شام کی طرف روانہ ہوں اور اس سے پہلے کہ دشمن ان پر حملہ کرے وہ جنگ کے لئے تیار رہیں۔

یہ تمام واقعات اس بات کی حکایت کرتے ہیں کہ پیغمبر اکرم ﷺ شمال یعنی روم کی طرف سے بہت نگراں تھے اور کہا کرتے تھے کہ ممکن ہے قیصر روم کی طرف سے اسلام کو سخت حملہ کا سامنا کرنا

پڑے۔

تیسرا دشمن ایران کی ساسانی شہنشاہی تھی۔ یہاں تک کہ خسرو پرویز نے پیغمبر اکرم ﷺ کا خط پھاڑ ڈالا تھا، سفیر کو قتل کر دیا تھا اور یمن کے گونز کو لکھا تھا کہ (معاذ اللہ) پیغمبر اکرم ﷺ کو قتل کر کے ان کا سر میرے پاس مدائن روانہ کرے۔

حجاز اور یمن عرصہ سے حکومت ایران کا حصہ شمار ہوتے تھے لیکن اسلام کے آنے کے بعد حجاج نہ صرف آزاد ہو گیا تھا بلکہ خود مختار ہو گیا تھا اور یہ امکانات بھی پیدا ہو گئے تھے کہ یہ محروم اور کچلی ہوئی قوم اسلام کے سایہ میں پورے ایران پر مسلط ہو جائے۔

اگرچہ خسرو پرویز پیغمبر اکرم ﷺ کی حیات میں گزر گیا تھا لیکن ساسانیوں کی حکومت سے یمن اور حجاز کا جدا ہو جانا ان لوگوں کے لئے اتنا بڑا ادھک تھا جو خسرو کے جانشینوں کے ذہن سے دور نہیں ہوا تھا۔ ساتھ ہی یہ بڑھتی ہوئی نئی طاقت جو ایمان و اخلاص اور فداکاری سے آراستہ تھی ان کے لئے ناقابل برداشت تھی۔

ایسے طاقتور دشمنوں کے ہوتے ہوئے کیا یہ درست تھا کہ پیغمبر اکرم ﷺ اس دنیا سے چلے جائیں اور امت اسلام کے لئے اپنا کوئی فکری و سیاسی جانشین مہین نہ کریں؟ ظاہر ہے کہ عقل، ضمیر اور سماجی محاسبات ہرگز اس کی اجازت نہیں دیتے کہ پیغمبر اکرم ﷺ سے اس طرح کی بھول ہوئی ہوگی۔ اور انھوں نے ان تمام حادثات و مسائل کو نا دیدہ قرار دیتے ہوئے اسلام کے گرد کوئی دفاعی حصار نہ بنایا ہوگا اور اپنے بعد کے لئے ایک آگاہ، مدبر و مدبر اور جہاندیدہ رہبر مہین نہ کیا ہوگا۔

روحی و معنوی کمال

معصوم امام کے سایہ میں

اس دنیا میں ہر وجود ایک مقصد کے تحت خلق ہوا ہے اور اس وجود کی غرض خلقت اور کمال اسی وقت حاصل ہوتا ہے جب اس تخلیق کا مقصد پورا ہو جائے۔ قدرت بھی موجودات کو کمال تک پہنچانے کے لئے ہر وہ وسیلہ اس کے حوالے کرتی ہے جو اسے کمال تک پہنچانے میں موثر ہوتا ہے۔ اس راہ میں وہ صرف ضروری وسائل پر اکتفا نہیں کرتی بلکہ ہر جزئی اور غیر ضروری وسائل بھی اسے عطا کرتی ہے۔ خوش قسمتی سے اس بارہ میں عالم طبیعت سے متعلق علوم (NATURAL SCIENCES) نے ہمارے زمانہ میں اپنی وسعت کے پیش نظر ہمیں ہر طرح کی مثال اور وضاحت سے بے نیاز کر دیا ہے۔

اگر ہم صرف انسانی جسم میں سننے اور دیکھنے کے حیرت انگیز وسائل پر غور کریں تو ان میں سے ہر ایک یہ پکار پکار کر کہتا نظر آئے گا کہ نظام خلقت نے ہر وجود کو اس کے کمال۔ جس کے لئے وہ خلق کیا گیا ہے۔ تک پہنچانے پر خاص توجہ دے رکھی ہے۔

اب ذرا ہم جسم کے دوسرے حصوں کے بارے میں غور کریں جن کی طرف سے زیادہ تر غفلت برتی گئی ہے اور اہمیت کے اعتبار سے اسے دوسروں پر ثانوی حیثیت دی گئی ہے۔! مثال کے طور پر ہم انسان کے تلوؤں کی ساخت اور ان کے خاص انداز کے گڑھوں پر غور کریں۔ ان کو خدا نے

اس غرض سے بنایا ہے کہ انسان کو چلنے میں آسانی ہو۔ حتیٰ جن کے پاؤں کے تلوے پیدا کنی طور سے بالکل ہموار ہوں وہ آپریشن کے ذریعہ تلوؤں میں گڑھے بنواتے ہیں تاکہ آسانی سے چل سکیں۔

ہماری انگلیاں لمبائی اور موٹائی کے لحاظ سے باہم فرق رکھتی ہیں کیوں کہ اگر وہ سب یکساں ہوتیں تو انسان ان سے جو بہت سے مختلف کام کرتا ہے نہیں کر پاتا۔ انگلیوں کے اس اختلاف ہی کی وجہ سے انسان ظریف اور باریک صنعتوں اور بہترین ہنر اور فنون کا خالق بنا ہے۔ اس کی ہتھیلیوں اور انگلیوں میں ایسے خطوط اور لائنیں ہیں جو ہر چھوٹی اور بڑی چیز کے اٹھانے یا پکڑنے میں اس کی مدد کرتی ہیں، اور چوں کہ ہر انسان کی انگلیوں کے خطوط ایک دوسرے سے جدا ہیں لہذا ہر فرد کی شناخت کے لئے اس کی انگلیوں کے نشانات لئے جاتے ہیں۔

یہ اور ان جیسی دوسری مثالوں سے ہم یہ نتیجہ لیتے ہیں کہ دست قدرت نے ہر طرح کے وسیلہ کو خواہ اس کے لئے ضروری ہو یا غیر ضروری جو بھی اس کے کمال کے لئے مؤثر ہے اس کے اختیار میں دیا ہے اور اس راہ میں اس کے لئے انتہائی سخاوت مندی کا مظاہرہ کیا ہے۔

اب یہ سوال پیش آتا ہے کہ جو خدا اس حد تک انسان کی سعادت و کمال کا خواہاں ہے، آخر یہ کیسے ممکن ہے وہ اس کے معنوی و روحانی کمال سے چشم پوشی کر لے؟!

یہ بیان جس طرح خداوند عالم کی جانب سے انبیاء و مرسلین کی بعثت کی ضرورت کو ثابت کرتا ہے، اسی طرح تمام معارف و احکام کے اسرار سے آگاہ امام معصوم کے تعین کو بھی لازمی قرار دیتا ہے۔ کیونکہ وحی الہی کی جانب سے ایک ایسے امام کا تعین اسلامی معاشرہ میں بہت سی کشمکشوں، جنگوں، نفاق اور معاشرہ کی پسماندگی کے خاتمہ کا سبب بنتا ہے اور مسلمانوں کو ایک جماعت اور ایک گروہ کی شکل میں تبدیل کر دیتا ہے اور ہر طرح کے اختلاف و تفرقہ سے جو رہبر و خلیفہ کے انتخاب کا لازمہ ہے نجات دے دیتا ہے۔ نتیجہ میں مسلمانوں کو ”ستیفہ بنی ساعدہ“ اور

دوسری پراسرار شوراؤں کا سامنا نہیں کرنا پڑتا۔

مسلمان پیغمبر ﷺ کی رحلت کے بعد الہی نص (خدا کی طرف سے کی جانے والی تعیین) سے چشم پوشی کر کے یا (جیسا کہ علمائے اہل سنت تصور کرتے ہیں) اللہ کی جانب سے نص نہ ہونے کی صورت میں۔ اس قدر اختلاف و تفرقہ کا شکار ہوئے کہ اس کے مخوس آثار چودہ صدیوں کے بعد بھی دور نہیں ہوئے۔ اور آج بھی استعماری طاقتیں جو مسلمانوں کو متحد دیکھنا نہیں چاہتیں مسلمانوں میں اختلاف برقرار رکھنے کے لئے آگ میں تیل ڈالنے کا کام کرتی رہتی ہیں۔

لیکن اگر مسلمان معاشرہ کا رہبر خدا کی جانب سے معین ہو اور مسلمان اپنے ناپختہ اور خام خیالات کو الہی نص و ہدایت پر مقدم نہ کریں تو مسلم طور سے مسلمانوں کی حالت ہر زمانہ میں اس سے کہیں بہتر ہو۔ اس کے علاوہ ہر طرح کے گناہ، خطا اور اشتباہ سے محفوظ اور شریعت کے معارف و احکام کے اسرار سے آگاہ امام معصوم کا وجود انسانی معاشرہ اور افراد کی روحانی ترقی اور کمال کی راہ میں ایک بڑا قدم ہے۔ پھر کیا یہ کہا جاسکتا ہے کہ ایسے رہبر کا وجود کیا انگلیوں اور ہتھلیوں کی لائینوں، پیروں کے تلوؤں کی گہرائیوں اور آنکھوں کے اوپر ابرو کے جتنا بھی اہمیت نہیں رکھتا ہے!؟

اس صورت میں کیا یہ کہا جاسکتا ہے کہ خداوند عالم نے انسان کے جسمانی کمال کے لئے تو ہر طرح کے وسائل اس کے اختیار میں دے دیئے لیکن معنوی کمال کے وسائل سے، جو اس کی روح کی ترقی میں موثر کردار ادا کرتے ہیں، اسے محروم کر دیا ہے۔

شیخ الرکیس ابن سینا نے کتاب ”شفا“ کی نبوت کی بحث میں مذکورہ بالا بیان سے انبیاء کی

بعثت کی ضرورت کو ثابت کیا ہے۔^۱ لیکن جیسا کہ ہم عرض کر چکے ہیں یہ بیان جس طرح انبیاء و مرسلین کی بعثت کی ضرورت کو ثابت کرتا ہے اسی طرح ایک معصوم اور شریعت کے اسرار سے آگاہ امام کی تعیین کو بھی پوری طرح ثابت کرتا ہے، جو انسانوں کے روحی کمال کا ذریعہ ہے۔

کیا شیعوں کا نظریہ امامت آزادی کے خلاف ہے

حریت و آزادی کا لفظ انسانوں کے کانوں میں پڑنے والا اب تک کا سب سے لطیف اور پر جوش لفظ ہے۔ اس لفظ کا سننا ہی لوگوں کے اندر کیف و نشاط، وجد و خوشی کی لہر پیدا کر دیتا ہے۔ ایک صحیح فکر رکھنے والے انسان کی سب سے بڑی آرزو اور تمنا قید و بند سے نجات، استعمار سے جہاد اور آزادی کی بلند بام چوٹی کو فتح کرنا ہے۔ آزادی سے متعلق انسان کا لگاؤ اتنا زیادہ ہے کہ اس نے اس راہ میں بہت سی قربانیاں دی ہیں اور حد سے زیادہ فداکاریاں کی ہیں۔

یہ درست ہے کہ انسان نے یہ بخوبی محسوس کر لیا ہے کہ اجتماعی زندگی ایک ایسے حاکم کے بغیر ممکن نہیں ہے جس کی رائے نافذ اور جس کا فیصلہ قطعی۔ لیکن ساتھ ہی وہ اس پر بھی ہرگز آمادہ نہیں ہے کہ اپنے مقدرات کسی ایسے شخص کے ہاتھ میں دے دے جس کے انتخاب کا اختیار اس کے ہاتھ میں نہ ہو۔ یہی وجہ ہے کہ خاص طور سے عصر حاضر میں معاشرہ کے حاکم و ذمہ دار کے تعین کے طریقوں میں وہ صرف اسی روش کو صحیح جانتا ہے، جس میں وہ اپنے رہبر کے انتخاب میں خود مختار اور آزاد ہو۔ جو حاکم ایک قوم کی سرنوشت کو اپنے ہاتھ میں لیتا ہے وہ خود عوام سے ابھرے اور عوام نے

اسے منتخب کیا ہو۔ ورنہ دوسری صورت میں وہ ایک فرد کی حکومت کو اصول آزاد کے خلاف اور جبر کی حاکمیت سمجھتا ہے۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ امامت کے سلسلہ میں پائے جانے والے دو نظریوں میں کون سا نظریہ ڈیوکریسی کے اصول سے زیادہ سازگار ہے، یہ کہ منصب امامت ایک انتخابی منصب ہے یعنی امام کو ”عام لوگوں کے ذریعہ یا اسلام کی اعلیٰ کمیٹی“ کے ہوتھوں چنا جانا چاہئے۔ یا یہ کہ رہبر اور جانشین پیغمبر کا انتخاب عوام کے ہاتھ میں نہ ہو بلکہ وہ سو فیصدی خدا کی جانب سے منسوب ہو یعنی امام کو خدا اور پیغمبر کی جانب سے معین ہونا چاہئے؟

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ پہلا نظریہ آزادی کے اصول سے زیادہ ہم آہنگ ہے۔ اگر ہم رسول خدا ﷺ کی جانشینی کے منصب کو انتخابی سمجھیں تو اس صورت میں ہمیں یہ فخر کرنا چاہئے کہ لیبر لیزم اور آزادی مغرب میں پروان چڑھنے سے پہلے مشرق میں اور ایک ہزار چار سو سال پہلے قابل عمل تھی۔ لیکن اس راہ سے ہم اس جگہ پہنچتے ہیں جہاں پہلے نظریہ پر عمل ہی نہیں ہوا۔

آج اہل سنت معاشرہ کے بعض اہل قلم شیعہ نظریہ یعنی امامت کے انتصابی ہونے کے موضوع پر تنقید کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ پیغمبر اکرم ﷺ کی جانشینی کا نصی ہونا آج کے سماجی نظریات اور آزادی کی روح سے کسی بھی طرح سازگار نہیں ہے۔

جواب: شاید جو سب سے اہم اور دلچسپ منطقی امام کے انتخابی ہونے کے سلسلہ میں پیش کی جا سکتی ہے اور جسے آج کے انسانی معاشرہ کے خیالات سے قریب قرار دیا جا سکتا ہے، وہی منطقی ہے جسے ہم اوپر بیان کر چکے ہیں اور جو کم و بیش بعض علمائے اہل سنت کے قلم سے بھی ظاہر ہو چکی ہے۔ اس طرز استدلال کا تفصیلی جواب اس پر منحصر ہے کہ موجودہ بحث کے تین اساسی نکاتے پوری طرح واضح ہوں:

۱۔ منصب امامت کا نصی یا منصوبی ہونا ”استبداد“ اور جبر سے بالکل جدا ہے۔

۲۔ مغرب کی جمہوری حکومتیں جو اقلیت پر اکثریت کی حکومت کی اساس پر استوار ہیں۔ وہ ان غیر عادلانہ سیاسی نظاموں میں سے ہیں جنہیں آج کے انسانوں نے مجبوراً قبول کیا ہے۔

۳۔ اگر یہ فرض کر لیں کہ حاکم کے انتخاب کے لئے یہی روش صحیح و درست ہے تو کیا صدر اسلام میں خلفاء کے انتخاب میں اس روش پر عمل ہوا ہے؟

ان تین نکتوں خاص طور سے دوسرے اور تیسرے نکتے پر مفصل بحث کی ضرورت ہے کہ ہم اختصار کے ساتھ ان میں سے ہر ایک پر روشنی ڈالتے ہیں۔

الف)۔ امام کا منصوب کیا جانا استبداد نہیں

استبدادی حکومتیں وہ انتہائی ظالمانہ طریقہ حکومت ہے جن سے انسان دوچار رہا ہے۔ استبدادی نظام جبر و تشدد کا وہ جانکاہ نظام ہے جنہیں انسانی معاشرہ زمانہ قدیم سے جھیلتا آ رہا ہے اور انسان کی معاشرتی زندگی میں اس کی مختلف شکلیں (گاؤں کا زمیندار، تعلقدار، قبیلہ کا سردار، یا مطلق العنان حاکم جو زمین کے وسیع علاقہ پر خود سرانہ حکومت کرتا ہے) نظر آتی رہی ہیں۔

استبداد کی بڑی شکل یہ کہ ایک شخص داخلی سطح پر بغاوت کے ذریعہ حاکم کو معزول کر کے خود حاکم ہو جاتا ہے یا غالباً اور دوسرے ملک کی فوجی طاقت کے ذریعہ حاکم ہو جاتا ہے اور ایسی حکومت کی بنیاد ڈالتا ہے جس میں صرف حاکم کی بات یا اس کا حکم ہی نافذ ہوتا ہے اور اپنے بعد کے حاکم کے لئے بھی اسی کا فیصلہ آخری فیصلہ ہوتا ہے۔

پیغمبر اکرم ﷺ کی جانشینی کے سلسلہ میں شیعوں کا نظریہ اس طرح کی حکومتوں سے میلوں کا فاصلہ رکھتا ہے۔ امام کے منصوبی ہونے سے شیعوں کا مقصد یہ ہے کہ امام خدا کی جانب سے جو سب کا خالق ہونے کے اعتبار سے تمام انسانوں پر اولویت اور حاکمیت کا حق رکھتا ہے۔ ایک سب سے زیادہ شائستہ فرد کی حیثیت سے جو ہر طرح کی جسمی و روحی آلودگی، برائی اور لغزش سے پاک ہے اور صرف اللہ کے حکم پر عمل کرتا ہے، پیغمبر اکرم ﷺ کے بعد مسلمانوں کا رہبر و پیشوا معین کیا

جائے۔

یہ کہنے کی ضرورت نہیں ہے کہ ایسا شخص اپنے منصب پر فائز ہونے کے بعد ہر طرح کی خود سری و خود رائی سے دور ہوگا اور صرف پیغمبر اکرم ﷺ کے لائے ہوئے قوانین کی بنیاد پر انسانی معاشرہ کو چلائے گا۔

چونکہ خداوند عالم خالق ہونے کی بنا پر فطری طور سے سب پر حکومت کا حق رکھتا ہے اور تمام قوموں نے اس کے قوانین کو جان و دل سے تسلیم کیا ہے لہذا امام بھی ان ہی قوانین کی بنیاد پر حاکم ہوا ہے اور معصوم ہونے کی بنا پر ہر طرح کے عمدی سہوی ظلم و ستم سے محفوظ ہے، ایسی حکومت معقول ترین حکومت ہے۔ اس طرح کی حکومت میں اقلیت و اکثریت (یعنی اکثریت کی ڈکٹیٹر شپ) کا تصور ہی نہیں ہے۔ اس میں صرف خدا کی رضا اور مخلوق کی مصلحت ہی پیش نظر ہوتی ہے (کوئی شخصی مرضی نہیں تھوپنی جاتی اور نہ ان افراد کی خوشی مد نظر ہوتی ہے جنہوں نے اسے حاکم بنایا ہے)۔

یہ الہی و آسمانی حکومت جس میں کسی بھی طرح کی خود سری اور خود خواہی نہیں ہے بھلا اس کا ان ظالم و استبدادی حکومتوں سے کیا تقابل۔ یہ دونوں طرز حکومت ایک دوسرے سے اس قدر فاصلہ رکھتی ہیں کہ ان میں کسی بھی مشترک پہلو کا تصور کیا ہی نہیں جاسکتا۔

(ب)۔ جمہوری حکومتوں کی کمزوریاں

آج کی جمہوری حکومتوں کی کمزوریاں ایک دو نہیں ہیں کہ یہاں ان پر تفصیل سے بحث کی جائے لیکن ہم یہاں نمونہ کے طور پر ان میں سے دو اہم کمزوریوں کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔

۱۔ اس طریقہ حکومت میں جو حاکم کسی پارٹی یا عوام کی ہاتھوں منتخب ہوتا ہے وہ ان کی رضا مندی و خوشنودی حاصل کرنے کی فکر میں رہتا ہے۔ ان کی ہدایت و رہبری کی فکر میں نہیں رہتا۔ کسی پارٹی یا گروہ کے سیاستدان کے لئے یہ اہم نہیں ہے کہ وہ حق کا ساتھ دے، اہم یہ ہے عوام کی حمایت سے اسے ہاتھ نہ دھونا پڑے۔ اس کام میں کبھی اس کے لئے لازم و ضروری ہو جاتا ہے کہ

اپنے ذاتی اعتقادات اور حقائق سے بھی آنکھیں بند کر لے۔ یہ وہ حقیقت ہے جس کا اظہار و اقرار دنیا کے ان عظیم سیاستدانوں نے بھی کیا جو عرصہ تک پوری دنیا کی سیاست سے کھیلے رہے ہیں امریکہ کا ایک گزشتہ صدر جان۔ ایف کینیڈی اپنی کتاب میں لکھتا ہے:

کبھی سینئر مجبور ہوتا ہے کہ کسی اہم موضوع کے سلسلہ میں عام جلسہ میں فوراً ہی اپنی رائے اور نظریہ کا اظہار کرے۔ اس میں شک نہیں ہے کہ وہ بھی غور و فکر کرنے کے لئے وقت چاہتا ہے تاکہ چند جملوں میں یا مختصر اصلاح کے ذریعہ شبہ و اختلاف کو بقدر امکان دور کرے، لیکن نہ اسے غور کرنے کا موقع ملتا ہے نہ وہ خود کو لوگوں سے چھپا سکتا ہے اور نہ ہی اپنی رائے کے اظہار سے گریز کر سکتا ہے۔ بالکل ایسا لگتا ہے جیسے تمام موکل جنہوں نے اسے سینئر بنایا ہے اس کی طرف آنکھیں گاڑے ہوئے اس بات کے منتظر ہیں کہ اس شخص کے رائے، جس سے اس کی سیاست کا مستقبل وابستہ ہے، کیا ہوگی۔

ان تمام باتوں کے علاوہ اس بات کی فکر کہ سینئر کی مراعات اس سے سلب نہ کر لی جائیں اور کہیں وہ اس چرب و نرم مشغلہ سے محروم نہ کر دیا جائے بڑے سے بڑے سیاستدان کی نیندیں حرام کئے رکھتی ہے۔

یہی وجہ ہے کہ بعض سینئر اس تکتہ کی طرف متوجہ ہوئے بغیر آسان اور کم خطرہ راہ اختیار کرتے ہیں۔ یعنی جب بھی ان کے ضمیر اور ان کے فیصلوں کے درمیان ٹکراؤ ہوتا ہے تو اپنی خود ساختہ منطق کے ذریعہ ضمیر کو مطمئن کر دیتے ہیں اور خود کو اپنے وہ وٹروں کے خیالات سے ہم آہنگ کر دیتے ہیں ایسے لوگوں کو ڈر پوک نہیں کہا جاسکتا بلکہ یہ کہنا چاہئے کہ یہ وہ لوگ

ہیں جنہیں رفتہ رفتہ عام لوگوں کے رجحان و خیالات کی پیروی کرنے کی عادت پڑ گئی ہے اور اپنی بھلائی اسی میں دیکھتے ہیں کہ بہتی گنگا میں ہاتھ دھوئیں۔ لیکن ان میں کچھ ایسے لوگ بھی ہیں جو اپنے ضمیر کو پکچل ڈالتے ہیں اور اپنے عمل کی توجیہ یوں کرتے ہیں۔ لوگوں میں نفوذ کرنے کے لئے پوری سچائی کے ساتھ اپنے ضمیر کی آواز سے کانوں کو بند کر لیتے ہیں۔ ”فرینک کینٹ“ کے بقول سیاست کو خلاف اخلاق مشغلہ نہیں کہا جاسکتا بلکہ یہ کہنا چاہئے کہ ”سیاست اخلاقی مشغلہ نہیں ہے“ ۱

سیاسی رائٹر ”فرینک کینٹ“ لکھتا ہے ”کہ زیادہ سے زیادہ ووٹ حاصل کرنے کا مسئلہ بہت ہی اہم اور سنجیدہ ہے۔ اس کے حصول کی راہ میں بلاوجہ کے مسائل مثلاً ”اخلاق“ یا ”حق و باطل“ پر کوئی توجہ نہیں کرنا چاہئے۔!.....“

اس سلسلہ میں ”مارک اشکال“ نے اپنے ایک ساتھی کو ۱۹۲۰ء کے امریکہ کے انتخابات میں بہترین نصیحت کی اور وہ یہ کہ ”تم عوام کو فریب دینا نہیں چاہئے۔ یعنی تم نمائندہ بننے کی راہ میں اپنے ضمیر کو پکچل نہیں رہو، بلکہ تم یہ بات سیکھو کہ ایک سیاسی آدمی کے لئے ایسے حالات پیش آتے ہیں جن میں وہ اپنے ضمیر سے چشم پوشی کرنے پر مجبور ہے۔“ ۲

یہ آج کی دنیا کے جمہوری لوگوں کی زبان میں سب سے زیادہ منصفانہ باتیں ہیں۔ اب آپ اس اجمال سے تفصیل کا اندازہ کر لیں۔ یہ آزاد ملکوں کی حکومتوں کی حقیقت ہے۔ کیا عقل و منطق

۱۔ سیمائے شجاعان، ص ۳۳، ۳۴

۲۔ سیمائے شجاعان، ص ۳۵

اس کی اجازت دیتی ہے کہ پیغمبر اکرم ﷺ کے جانشین کو جسے بہت سی جہات میں ان ہی کی طرح ہونا چاہئے، اس جمہوری طریقہ پر یعنی عوام کے خیالات کے ذریعہ یا ارباب حل و عقد کی بیعت یا مہاجرین و انصار کی بیعت کے ذریعہ منتخب ہونا چاہئے؟ ہرگز نہیں..... کیوں کہ اس طریقہ سے منتخب ہونے والا شخص فکری طور سے مستقل مزاج نہیں ہوتا بلکہ اپنے ووٹروں کے افکار و خیالات کا ترجمان ہوتا ہے۔ ایسے افراد بہت ہی کم اور نادر ہیں جو اپنی شہرت کو ٹھوک مارنے پر آمادہ ہو جائیں اور عمومی خیالات و رجحان کے طوفان سے نہ ڈریں اور جو بات امت کی بھلائی کے لئے ہو اسی پر عمل کریں۔

ممكن ہے یہ خیال کیا جائے کہ ووٹروں کی رضا مندی کا لحاظ اسی وقت لازم ہے جب حکومت کی مدت چند سال میں محدود ہو، لیکن چونکہ امام کی رہبری دائمی ہے اور دائمی حاکم کی حیثیت رکھتی ہے جیسا کہ آج بھی بعض ملکوں میں عملی طور پر رائج ہے لہذا ضروری نہیں کہ خلافت کی کرسی پر بیٹھنے کے بعد امام و خلیفہ عوام کی رضا مندی و خوشنودی حاصل کرنے کی فکر میں ہو۔

تو جواب یہ ہے کہ یہ خیال بہت ہی خام اور بیجا ہے، کیوں کہ:

اول تو: خود اس دائمی حاکمیت میں بھی عام انتخاب کرنے والوں کے خیالات و رجحان کو نادیدہ نہیں کیا جاسکتا، کیونکہ بے توجہی کی صورت میں حاکم کو انقلاب، شورش اور بغاوت کا سامنا کرنا پڑے گا۔

دوسرے یہ کہ: کئی امیدواروں کی موجودگی میں کسی ایک شخص کا ایک گروہ کی طرف سے منتخب کہا جانا کسی تعاون و ہم خیالی کے وعدہ کے بغیر عملی نہیں ہے۔ اور اس بات کو دیکھتے ہوئے اگر وہ اپنے کئے ہوئے وعدہ سے چشم پوشی کر لے تو یہ خود ایک بہت بڑی خرابی ہے کیونکہ اس صورت میں معاشرہ کے مربی نے عملاً وعدہ خلافی کی ہے اور دوسروں کو بھی اس راہ پر چلنا سکھایا ہے۔

عمر نے اپنی موت کے بعد خلیفہ کے انتخاب کے لئے جو چھ نفری کمیٹی بنائی تھی اس میں ”عبد الرحمن بن عوف“ نے جس کا جھکاؤ کمیٹی کے دو گروہوں کے درمیان فیصلہ کن تھا،

حضرت علیؑ سے کہا: میں آپ کی بیعت کرتا ہوں لیکن اسی شرط پر کہ آپ اللہ کی کتاب اور رسولؐ کی سنت اور شیخین کی سیرت پر عمل کریں گے، حضرت علیؑ نے فرمایا: میں صرف خدا کی کتاب، رسولؐ کی سنت اور اپنی عقل و فکر کی بنیاد پر عمل کروں گا۔ اس موقع پر عبد الرحمان بن عوف نے عثمان سے بھی اسی جملہ کا اقرار لیا اور عثمان نے عبد الرحمان کی شرط پر اپنی وفاداری کا اعلان کیا اور خلیفہ منتخب ہو گئے (اور بعد میں سب نے دیکھا کہ انہوں نے اپنی مرضی سے بنی امیہ کو لوگوں پر مسلط کر دیا۔)

مختصر یہ کہ اکثر لوگوں کا انتخاب کرنے والے ایسی شرطیں رکھتے ہیں جس کا ماننا ایک باایمان اور باضمیر شخص کے لئے بڑا ہی سخت اور ناگوار ہوتا ہے۔ ظاہر ہے کہ حق شناس ان افراد شرطوں کو تسلیم نہیں کرتے لہذا منتخب بھی نہیں ہوتے اور ان کی جگہ غیر صالح افراد ہر طرح کی شرط قبول کر لیتے ہیں اور منتخب ہو جاتے ہیں۔

امریکہ کے صدر کے انتخاب میں آزاد سے آزاد شخص بھی عالمی صیہونزم کی مدد کو اپنے دستور العمل میں اولویت دینے پر مجبور ہوتا ہے اور ووٹ بنانے والی کمیٹیوں سے یہ وعدہ کرتا ہے کہ اگر منتخب ہو گیا تو اسرائیل کی مدد کرے گا۔ چاہے وہ یہ جانتا ہو کہ اس کا یہ عمل عدالت اور انسانیت کے اصول کے سراسر خلاف ہے۔

۲۔ مغرب کی جمہوری حکومتوں پر دوسرا اعتراض یہ ہے کہ اس جمہوریت کی بازگشت ایک طرح کے ظلم و ڈکٹیٹر شپ "تعداد کی ڈکٹیٹر شپ" اور "اکثریت کا اقلیت پر استبداد و ظلم" ہے۔ کیونکہ اگر یہ فرض بھی کر لیں کہ انتخابات بالکل صحیح اور کسی چال بازی کے بغیر انجام پائے ہیں اس کے باوجود اکثریت جو صرف ایک ووٹ سے جیتی ہے اس اقلیت پر حکومت کرے گی جو صرف ایک ووٹ سے نہیں جیتی جب کہ ممکن ہے کہ بہت سے موارد میں حق اقلیت کے ساتھ ہو اس کا مطلب یہ ہے صرف ایک ووٹ کے ذریعہ ایک ملک اور قوم کے منافع و مصلحتیں ضائع ہو جائیں! اسی وجہ سے کہا جاتا ہے کہ ۴۹ پر ۵۱ افراد کی حکومت ایک طرح کی ظالمانہ حکومت ہے جسے انسان نے مجبوری کی بنا پر اور اس

سے بہتر طریقہ نہ ہونے کی صورت میں یا کسی اور راہ کی طرف توجہ دیئے بغیر، جس کی طرف اسلام نے رہنمائی کی ہے، اپنا پا ہے۔

لیکن خدا کی جانب سے پیغمبر اسلام ﷺ کے جانشین کے انتخاب میں جیسا کہ اوپر بیان ہو چکا ہے ان تمام نا انصافیوں کا سدباب کر دیا گیا ہے۔ امام کو وہ منتخب کرتا ہے جس کے حق حاکمیت پر سب راسخ ایمان رکھتے ہیں اور امام ان قوانین کے مطابق حکومت کرتا ہے جسے تمام لوگ قبول کرتے۔ یہاں پر اقلیت و اکثریت کا مسئلہ ہی پیش نہیں آتا۔

ان سب باتوں کے علاوہ جمہوری نظاموں میں اکثریت کی خواہشات اور آرزوئیں قانون کی شکل اختیار کر لیتی ہیں اور ان کے ارادے قطعی فیصلوں اور محکم حکم کی صورت میں تمام لوگوں پر لا دیئے جاتے ہیں، لیکن اسلامی قوانین کی روح، جس میں ہمیشہ انسانی معاشرہ کی مصلحتوں کو ہی شریعت کا رنگ ملتا ہے، ایسے پست نظریہ کی تائید نہیں کر سکتی۔

قرآن مجید جس نے ہمیشہ لوگوں کے افکار و خیالات کو خطا و غلطی سے آلودہ بنایا ہے اور اکثریت کے بارہ میں فرماتا ہے (واکثرہم لایعقلون) اور (واکثرہم لایشعرون) پھر وہ دین کے سب سے اہم موضوع یعنی امت کی امامت یا قیادت کے انتخاب کے سلسلہ میں معاشرہ کی اکثریت کے رجحان کو کیسے مؤثر و نافذ سمجھ سکتا ہے؟ کیا قرآن کریم نے یہ نہیں فرمایا: (وعسلی ان تکروہوا شیئا وھو خیر لکم و عسلی ان تحبوا شیئا وھو شر لکم) یعنی بعض اوقات تم کسی چیز کو ناپسند کرتے ہو جب کہ وہ تمہارے لئے مفید و نفع بخش ہوتی ہے اور بعض اوقات کسی چیز کو تم پسند کرتے ہو جب کہ وہ تمہارے لئے مضر و نقصان دہ ہے۔ یہ وہ قانون ہے جو معاشرہ کی اکثریت کی نفسانی خواہشات کو صراحت کے ساتھ خطا شمار کرتا اور فرماتا ہے اکثر لوگوں کے خواہشات

کیا شیعوں کا نظریہ امامت آزادی کے خلاف ہے..... ۷۱

ایسی چیز کا تقاضا کرتے ہیں جو خطرناک اور نقصان دہ ہوتی ہے اور کبھی ایسی چیز سے نفرت کا اظہار کرتے ہیں جو سو فی صدی ان کے لئے مفید ہوتی ہے۔ اس روشنی میں امام کے انتخاب یا تعیین کو جو پیغمبر اسلام ﷺ کے بعد سب سے اعلیٰ دینی منصب ہے، ناقابل اعتبار اکثریت کے حوالے نہیں کیا جاسکتا۔

(ج)۔ کیا صدر اسلام میں خلیفہ کا انتخاب اکثریت نے کیا؟

بعض تو جیہیں واقعہ کے گزر جانے کے بعد اسباب تراشی کرتی ہیں اکثر ایسا ہوتا ہے کہ ایک معاشرتی واقعہ بعض حالات و شرائط کے تحت وجود میں آتا ہے۔ بعد میں آنے والے اس واقعہ کو وجود میں لانے والوں کے فیصلوں کی بنیاد اپنے حدس و گمان پر رکھتے ہیں اور اس واقعہ کے لئے بے جہت خوش بینی کی بنا پر ایسے اخلاقی، فکری اور سماجی اسباب و علل تراشتے ہیں کہ واقعہ کو وجود میں لانے والوں کی روح کو ان کی بھی خبر نہیں ہوتی۔

اتفاق سے خلفاء کی حکومت کے لئے جمہوری نوعیت اور عوام پر عوام کی حکومت یا اقلیت پر اکثریت کی حکومت کی توجیہ اس کا روشن و واضح مصداق ہے دراصل صدر اسلام کے خلفاء کے انتخاب میں جو چیز وجود میں نہیں آئی وہ عوام کے ذریعہ خلفاء کا انتخاب تھا۔ کیوں کہ نہ اہل سنت کے محقق علماء خلیفہ کے انتخاب میں اس اصل کے معتقد ہیں اور نہ خلفاء کا انتخاب اس طریقہ سے انجام پایا۔ اس کے باوجود عصر حاضر کے بعض اہل قلم ان خلفاء کی خلافت کو صحیح و درست بتانے کے لئے ہمارے زمانہ کی چیز یعنی جمہوریت اور مغربی لیبرلزم کا سہارا لیتے ہیں اور عوام پر عوام کی حکومت یا اقلیت پر اکثریت کی حکومت کی مثال پیش کرتے ہیں جب کہ اس طرح کی توجیہات واقعہ کے وجود میں آنے کے بعد عالم تشیل میں اس کی اسباب تراشی ہے اور خلافت کا ہرگز اس سے کوئی ربط نہیں رہا ہے۔ اب ہم مزید اطمینان کے لئے اس سلسلہ میں بعض قدیم علماء کے اقوال نقل کرتے ہیں:

قاضی ایچی اپنی مشہور کتاب شرح مواقف میں لکھتے ہیں: امام کے انتخاب کے لئے کسی فرد کے خلافت پر اجماع یا امت کے اتفاق کی ضرورت نہیں ہے بلکہ اصحاب پیغمبر ﷺ میں سے ایک یا دو شخص کی بیعت یا بیان سے ہی اس شخص کی خلافت قانونی صورت اختیار کر لیتی ہے اور اس کی دلیل یہ ہے کہ اصحاب پیغمبر ﷺ نے دینی امور میں کمال ایمان کی وجہ سے صرف حضرت ابو بکر کی رائے کو کافی سمجھا جنہوں نے عمر کو اپنے بعد خلافت کے لئے معین کیا اور نہ صرف تمام مسلمانوں کے اتفاق رائے کو شرط نہیں جانا بلکہ خود مدینہ میں رہنے والے صحابہ کے اتفاق رائے کو بھی ضروری نہیں سمجھا۔ ۱

”احکام السلطانیہ“ کے مؤلف لکھتے ہیں: بعض لوگ یہ تصور کرتے ہیں خلیفہ کا انتخاب اسلامی شہروں میں رہنے والی بزرگ اسلامی شخصیتوں کی تصویب سے انجام پاتا ہے، جبکہ ابو بکر سفید بنی ساعدہ میں صرف پانچ افراد کی رائے سے خلیفہ ہوئے، عمر، ابو عبیدہ، اسید بن حضیر، بشر بن سعد اور سالم مولیٰ ابو حذیفہ۔ ۲

اسلامی خلافت کی تاریخ گواہ ہے کہ عمر نے کی خلافت صرف حضرت ابو بکر کی تعیین کے ذریعہ قانونی ہوگی اور حضرت عمر نے بھی خلافت کے لئے کسی شخص کے انتخاب کا اختیار چھ نفری کمیٹی کے حوالے کر دیا اور بقیہ تمام مسلمانوں کو انتخاب ہونے اور انتخاب کرنے سے محروم کر دیا۔ قاضی باقانی لکھتے ہیں: ابو بکر کا انتخاب حضرت عمر کی کوشش اور دوسرے چار افراد کے ذریعہ انجام پایا؟۔ ۳

۱۔ شرح مواقف، ج ۳ ص ۲۶۵

۲۔ الاحکام السلطانیہ، ص ۴

۳۔ التصدیق، ص ۱۷۸۔

کیا شیعوں کا نظریہ امامت آزادی کے خلاف ہے..... ۷۳

حضرت امیر المؤمنین علیؑ کی شہادت کے بعد خلافت بنی امیہ اور بنی عباس کے خاندانوں میں موروثی سلطنت کی شکل اختیار کر گئی، جس کی کہانی بہت ہی دردناک ہے اور یہاں اس کے بیان کی گنجائش بھی نہیں ہے۔

نویں فصل

اسلام میں مشورہ

اس میں کسی بحث کی ضرورت نہیں کہ مشورہ کے ذریعہ بہت سی انفرادی و اجتماعی مشکلات حل ہوتی ہیں۔ دو فکروں کا ٹکراؤ گویا بجلی کے دو مثبت و منفی تاروں کے ٹکرانے کے مانند ہے جس سے روشنی پیدا ہوتی ہے اور انسان کی زندگی کی راہ روشن ہو جاتی ہے۔

مشورہ مشکلات کے حل کے لئے اس قدر اہم ہے کہ قرآن کریم پیغمبر اکرم ﷺ کو حکم دیتا ہے کہ زندگی کے مختلف امور میں مشورہ کرو۔ چنانچہ فرماتا ہے:

”وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ فَإِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللَّهِ إِنَّ اللَّهَ

يُحِبُّ الْمُتَوَكِّلِينَ“

یعنی اپنے فیصلوں میں ان سے مشورہ کرو اور جب فیصلہ کر لو تو خدا پر بھروسہ کرو۔ بلاشبہ خدا تو کل کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے۔

خداوند عالم ایک دوسری آیت میں صاحبان ایمان کی یوں تعریف کرتا ہے:

”وَالَّذِينَ اسْتَجَابُوا لِرَبِّهِمْ وَاَقَامُوا الصَّلَاةَ وَاَمْرَهُمْ شُورَىٰ بَيْنَهُمْ
وَمِمَّا رَزَقْنَاهُمْ يُنْفِقُونَ“ ۱

یعنی جو لوگ اپنے خدا کی آواز پر لبیک کہتے ہیں اور نماز قائم کرتے
ہیں اور ان کے فیصلوں اور کاموں کی بنیاد ان کا آپسی مشورہ ہے اور جو کچھ
خدا انھیں رزق دیتا ہے اس میں سے انفاق کرتے ہیں۔

لہذا ہم دیکھتے ہیں کہ عقل اور نقل دونوں نے مشورہ کی اہمیت کو واضح کیا ہے اور کیا اچھا ہو کہ
مسلمان اسلام کے اس عظیم دستور کی پیروی کریں جس میں ان کی سعادت و خوشحالی اور سماج کی ترقی
پوشیدہ ہے۔

پیغمبر اکرم ﷺ نہ صرف لوگوں کو یہ روش اپنانے کا حکم دیتے تھے بلکہ آپؐ نے اپنی زندگی
میں خود بھی خدا کے اس فرمان پر عمل کیا ہے۔ جنگ میں جبکہ ابھی دشمن کا سامنا نہیں ہوا تھا، بدر کے
صحرا میں آگے بڑھنے اور دشمن سے مقابلہ کے سلسلہ میں آپؐ نے اپنے ساتھیوں سے مشورہ کیا اور
ان سے فرمایا: ”اشيروا الي ايها الناس“ قریش سے جنگ کے سلسلہ میں تم لوگ اپنا نظریہ بیان
کر دو کہ ہم لوگ آگے بڑھ کر دشمن سے جنگ کریں یا یہیں سے واپس ہو جائیں؟ مہاجرین و انصار کی
اہم شخصیتوں نے دو الگ الگ اور متضاد مشورے دیئے لیکن آخر کار پیغمبر اکرم ﷺ نے انصار کا
مشورہ قبول کیا۔ ۲

اُحد کی جنگ میں بڑے بڑے لوگ قلعہ ہندی اور مدینہ میں ہی ٹھہرنے کے طرفدار تھے
تاکہ بروجوں اور مکانوں کی چھتوں سے دشمن پر تیر اندازی اور بھڑوں کی بارش کر کے شہر کا دفاع
کریں، جبکہ جوان اس بات کے طرفدار تھے کہ شہر سے باہر نکل کر جنگ کریں اور بوڑھوں کے نظریہ کو

۱۔ شوریٰ، ۳۸۔

۲۔ سیرۃ ابن ہشام، ج ۱، ص ۶۱۵، مغازی و اقدی، ص ۳۸۔

زنانہ روش سے تعبیر کرتے تھے۔ یہاں پیغمبر اسلام ﷺ نے دوسرے نظریہ کو اپنایا۔ ۱۔
جنگ خندق میں پیغمبر اسلام ﷺ نے ایک فوجی کمیٹی تشکیل دی اور مدینہ کے حساس علاقوں کے گرد
خندق کھودنے کا جناب سلمان کا مشورہ قبول کیا اور اس پر عمل کیا۔ ۲۔

طائف کی جنگ میں لشکر کے بعض سرداروں کے مشورہ پر فوج کو ایک جگہ سے دوسری جگہ
منتقل کیا۔ ۳۔

لیکن اس بات پر توجہ ہونی چاہئے کہ کیا صرف مشورہ اور تبادلہ خیالات ہی مشکلات کا حل
ہے یا یہ کہ پہلے عقل و فکر کے اعتبار سے بانفوذ مرکزی شخصیت جلد تشکیل دے اور تمام آراء کے در
میان سے ایک ایسی رائے منتخب کرے اور اس پر عمل کرے جو اس کی نظر میں بھی حقیقت سے
قریب ہو۔

معمولاً مشوروں کے جلسوں میں مختلف افکار و نظریات پیش کئے جاتے ہیں اور ہر شخص اپنے
نظریہ کا دفاع کرتے ہوئے دوسروں کی آراء کو ناقص بتاتا ہے۔ ایسے جلسہ میں ایک مسلم الثبوت
رییس و مرکزی شخص کا وجود ضروری ہے، جو تمام لوگوں کی رائے سنے اور ان میں سے ایک قطعی رائے
منتخب کرے۔ ورنہ دوسری صورت میں مشورہ کا جلسہ کسی نتیجہ کے بغیر ہی ختم ہو جائے گا۔

اتفاق سے وہ پہلی ہی آیت جو پیغمبر اسلام ﷺ کو اپنے ساتھیوں سے مشورہ کا حکم دیتی
ہے مشورہ کے بعد سے یوں خطاب کرتی ہے: ”فاذا عزمتم فسوكل على الله“ پس جب تم
فیصلہ کر لو تو خدا پر بھروسہ کرو۔ اس خطاب سے مراد یہ ہے کہ پیغمبر اسلام ﷺ سے یہ بات کہی جا
رہی ہے کہ مشورہ کے بعد فیصلہ کرنے والی مرکزی شخصیت خود پیغمبر اکرم ﷺ کی ذات ہے لہذا

۱۔ سیرہ ابن ہشام، ج ۲، ص ۶۳، ۶۴، مغازی و اقدی، ج ۱، ص ۲۰۹

۲۔ تاریخ کامل، ج ۳، ص ۱۳۲

۳۔ مغازی و اقدی، ج ۳، ص ۹۲۵

پیغمبر ﷺ کو ہی فیصلہ کرنا اور خدا پر بھروسہ کرنا چاہئے۔

جمعیت کا پیشوا اور ہبر، جس کے حکم سے مشورہ کا جلسہ تشکیل پایا ہے ممکن ہے کہ لوگوں کے درمیان کسی تیسرے نظریہ کو اپنائے جو اس کی نظر میں ”صلح“ یعنی زیادہ بہتر ہو۔ جیسا کہ پیغمبر اکرم ﷺ نے صلح حدیبیہ کے موقع پر اپنے اصحاب کے عمومی خیالات کی مخالفت کی اور مسلمانوں اور قریش کے بت پرستوں کے درمیان صلح کی قرارداد باندھی اور خود صلح یا صلح نامہ کے بعض پہلوؤں سے متعلق اپنے اصحاب کے اعتراضات پر کان نہیں دیئے اور زمانہ نے یہ بات ثابت کر دی کہ پیغمبر اکرم ﷺ کا فیصلہ مسلمانوں کے حق میں مفید تھا۔

اسلام میں مشورہ اور جمہوری حکومتوں کے مشورہ۔ جس میں ملکی قوانین پاس کرنا پارلیمنٹ اور سینٹ دونوں مجلسوں کے اختیار میں ہے اور حکومت کا صدر صرف ان دو مجلسوں کے تصویب شدہ قوانین کا اجرا کرنے والا ہے۔ — میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ یہاں حکومت کا رئیس و حاکم جو خود پیغمبر اکرم ﷺ ہیں، اقلیت یا اکثریت کی آراء کے مطابق عمل کرنے پر مجبور نہیں ہے۔ بلکہ آخری رائے یا آخری فیصلہ کا اظہار، چاہے وہ اہل مجلس کی رائے کے، موافق ہو یا مخالف، خود پیغمبر اکرم ﷺ کے اوپر ہے۔ اور یہ پہلے عرض کیا جا چکا کہ مشورہ کے بعد قرآن کریم پیغمبر اکرم ﷺ کو حکم دیتا ہے کہ اب آپ خدا پر توکل کریں، فیصلہ کریں اور آگے بڑھیں۔

دوسری آیت کا مطلب بھی یہی ہے۔ دوسری آیت تبادلہ خیال کو بائمان معاشرہ کی ایک بہترین خوبی شمار کرتی ہے۔ لیکن یہ بائمان معاشرہ پیغمبر ﷺ کے زمانہ میں ہرگز ایک نافذ اور مطلق العنان رئیس سے خالی نہیں تھا اور عقل یہ کہتی ہے کہ آنحضرتؐ کی رحلت کے بعد بھی بائمان معاشرہ کو ایسی شخصیت سے خالی نہیں رہنا چاہئے۔ یہ آیت ایسے معاشروں کی طرف اشارہ کر رہی ہے جنہوں نے حاکم و رہبر کے تعین کا مرحلہ طے کر لیا ہے اور اب دوسرے مسائل میں مشورہ یا تبادلہ خیال کرتے ہیں۔

اس بیان سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ بعض علمائے اہل سنت کا ان آیات سے مشورہ کے ذریعہ خلیفہ کے انتخاب کو صحیح قرار دینا درست نہیں ہے۔ کیونکہ جیسا کہ ہم عرض کر چکے ہیں مذکورہ آیات ان معاشروں سے متعلق ہیں جن میں حاکم کے تعین کی شکل پہلے سے حل ہو چکی ہے اور مشورتی جلسے اس کے حکم سے تشکیل پاتے ہیں تاکہ مسلمان اپنے دوسرے امور میں تبادلہ خیال کریں، خاص طور سے پہلی آیت جو صاف طور سے پیغمبر ﷺ سے جو مسلمانوں کے رہبر ہیں۔ خطاب کرتی ہے کہ مشورہ کے بعد فیصلہ کر لو اور اس کے مطابق عمل کرو۔

اس کے علاوہ عمومی افکار و خیالات کی طرف رجوع اس سلسلہ میں ہے جس میں خداوند عالم کی طرف سے مسلمانوں کے لئے کوئی فریضہ معین نہ کیا گیا ہو۔ ایسے میں مسلمان تبادلہ خیال کے ذریعہ اپنا فریضہ معلوم کر سکتے ہیں، لیکن جس امر میں نص کے ذریعہ سب کا فریضہ معین کیا جا چکا ہے اس میں مشورہ کی ضرورت ہی نہیں ہے۔

یہی وجہ ہے کہ جب ”حباب منذر“ پیغمبر اکرم ﷺ کے پاس آئے اور فوج کے مرکز کو دوسری جگہ منتقل کرنے کی درخواست کی تو پیغمبر ﷺ سے خطاب کر کے عرض کیا ”فان كان عن امر سلمنا وان كان عن الراي فالناخير عن حصنهم“۔ یعنی اگر اس سلسلہ میں کوئی الہی حکم ہے تو ہم تسلیم ہیں اور اگر ایسی بات ہے کہ ہم اس میں اپنی رائے دے سکتے ہیں تو لشکر اسلام کی مرکزی کمان کو دشمن کے قلعہ سے دور میں ہی بھلائی ہے۔

حضرت علیؓ کی خلافت و جانشینی کا موضوع ایسا مسئلہ ہے جسے بہت سے نقلی دلائل نے ثابت اور واضح کر دیا ہے اور پیغمبر اکرم ﷺ نے خدا کے حکم سے بہت سے موقعوں پر مثلاً یوم الدار، غدیر خم، اور بیماری کے ایام میں ان کی خلافت و جانشینی کو صراحت سے بیان کر دیا ہے۔ پھر اب

مشورہ کے ذریعہ آنحضرتؐ کی جائشینی کی تعیین کا مسئلہ حل کیا جانا ہے کیا معنی رکھتا ہے۔ کیا یہ عمل نص کے مقابلہ میں اجتہاد اور خدا کے قطعی حکم یا دلیل کے مقابل اپنے نظریہ کا اظہار نہیں ہے؟

قرآن مجید ایک آیت کے ضمن میں اس حقیقت کی طرف اشارہ کرتا ہے: جب پیغمبر اکرمؐ کے منہ بولے بیٹے زید نے اپنی بیوی جناب زینب کو طلاق دے دی اور پیغمبر اکرمؐ نے خدا کے حکم سے جناب زینب سے شادی کر لی تو یہ بات مسلمانوں کو بہت بری لگی کیونکہ جاہلیت کے زمانہ میں منہ بولا بیٹا حقیقی بیٹے کی طرح سمجھا جاتا تھا اور جس طرح نسبی بیٹے کی بیوی سے شادی ناپسندیدہ اور حرام تھی اسی طرح منہ بولے بیٹے کی بیوی سے بھی شادی ناروا اور قبیح سمجھی جاتی تھی۔

مسلمانوں کو یہ توقع تھی کہ آنحضرتؐ ہمارے نظریات کے پیرو ہوں گے اور ہمارے خیالات کا احترام کریں گے۔ جبکہ پیغمبر اکرمؐ نے یہ عمل خداوند عالم کے حکم سے اور جاہلیت کے رسم و رواج کو غلط قرار دینے کے لئے انجام دیا تھا۔ اور ظاہر ہے کہ خدا کے حکم کے ہوتے ہوئے عام لوگوں کے افکار و خیالات کی طرف توجہ دینا کوئی معنی نہیں رکھتا۔

یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم نے مندرجہ ذیل آیت کے ذریعہ ان موارد میں اپنی مداخلت اور اپنے خیالات کے اظہار کو شدت سے محکوم کیا ہے، جن میں اللہ کے حکم نے مسلمانوں کے لئے کوئی خاص فریضہ معین کر دیا ہو۔ قرآن فرماتا ہے:

”وما كان لمومن ولا مومنة اذا قضى الله ورسوله امرا ان يكون لهم

الخيرة من امرهم ومن يعص الله ورسوله فقد ضلّ ضلالا مبينا“ ۱

”یعنی جب خدا اور اس کا رسول کسی سلسلہ میں حکم دے دیں پھر کسی مومن یا مومنہ کو اپنے امور میں کوئی اختیار نہیں ہے (انھیں بہر حال خدا کے حکم کی پیروی کرنا ہوگی) اور جو شخص خدا اور اس کے رسول کے فرمان سے سرتابی کرے گا وہ کھلا ہوا گمراہ ہے“

دسویں فصل

یک طرفہ فیصلہ نہ کریں

اسلام میں وہ تنہا خلیفہ، جو مہاجر و انصار کی قریب با اتفاق اکثریت سے منتخب ہوا، امیر المؤمنین علی علیہ السلام تھے۔ اسلامی خلافت کی تاریخ میں یہ امر بالکل بے نظیر تھا اور اس کے بعد بھی اس کی کوئی مثال نظر نہیں آتی۔

اس دوران جب معاویہ (جس نے مدتوں پہلے شام میں اپنی بادشاہت اور مطلق العنانیت کی داغ بیل ڈالی تھی اور خاندان رسالت کے ساتھ دیرینہ اور عمیق بغض و عداوت رکھتا تھا) اس امر سے آگاہ ہوا کہ مہاجرین و انصار نے حضرت علی علیہ السلام کو خلیفہ منتخب کر لیا ہے، تو سخت برہم ہوا اور امام سے بیعت کرنے کیلئے تیار نہ ہوا۔ اس نے نہ صرف امام کی بیعت کرنے سے انکار کیا بلکہ حضرت پر حضرت عثمان کے قتل اور اس کے قاتلوں کی حمایت کی تہمت بھی لگادی!

امام، معاویہ کو خاموش کرنے اور اس کیلئے ہر قسم کے عذر کے راستوں کو مسدود کرنے کیلئے اپنے ایک خط میں اسے تحریر فرماتے ہیں کہ:

”وہی لوگ جنہوں نے ابوبکر، عمر اور عثمان کی بیعت کی تھی، میری بھی بیعت کر چکے ہیں، اگر ان کی خلافت کو اس لحاظ سے قابل احترام سمجھتے ہو کہ مہاجرین و انصار نے ان کی بیعت کی تھی تو یہ شرط میری خلافت میں بھی موجود ہے۔“

امام کے خط کا متن:

”انه بايعنى القوم الذين بايعوا ابا بكر و عمر و عثمان على ما بايعوهم عليه فلم يكن للشاهد أن يختار و لا للغائب أن يرد و إنما الشورى للمهاجرين والأنصار فان اجتمعوا على رجل و سموه اماماً كان ذلك (لله) رضا“^۱۔

”جن افراد نے ابو بکر، عمر اور عثمان کی بیعت کی تھی، وہ میرے ساتھ بھی بیعت کر چکے ہیں اس صورت میں مدینہ میں حاضر شخص کو کسی اور کو امام منتخب کرنے اور مرکز شوریٰ سے دور کسی فرد کو ان کا نظریہ مسترد کرنے کا حق نہیں ہے۔ شوریٰ کی رکنیت صرف مہاجر و انصار کا حق ہے۔ اگر انہوں نے کسی شخص کی قیادت و امامت پر اتفاق نظر کیا اور اسے امام کہا، تو یہ کام خدا کی رضا مندی کا باعث ہوگا۔

امام علیہ السلام کے اس خط کا مقصد، معاویہ کو خاموش کرنے، اس کی ہر قسم کی بہانہ تراشی اور خود غرضی کا راستہ بند کرنے اور قرآن مجید کی اصطلاح میں ”مجادلہ احسن“ کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔ کیونکہ معاویہ شام میں حضرت عمر اور اس کے بعد حضرت عثمان کی طرف سے مدتوں گورنر رہ چکا تھا اور انھیں خلیفہ رسول اور اپنے آپ کو ان کا نمائندہ جانتا تھا۔ ان حضرات کی خلافت کا احترام اسی جہت سے تھا کہ وہ مہاجر و انصار کی طرف سے منتخب ہوئے تھے، اور بالکل یہی انتخاب واضح اور مکمل صورت میں امام علیہ السلام کے حق میں بھی انجام پایا تھا اس لئے کوئی وجہ نہیں تھی کہ ایک کو قبول اور دوسرے کو مسترد کیا جائے۔

امام علیہ السلام نے قرآن مجید میں حکم شدہ مجادلہ کے ذریعہ^۲ اپنی خلافت کے بارے میں معاویہ کی مخالفت کی مذمت کرتے ہوئے فرمایا:

۱۔ صحیح البلاغ، جلد نمبر ۶۔

۲۔ ﴿و جادلہم بالیٰ ہی احسن﴾ (نحل/۱۲۵)

”جنہوں نے ابو بکر اور عمر و عثمان کی بیعت کی تھی، وہی میری بیعت بھی کر چکے ہیں، لہذا اب تم میری خلافت کو جائز کیوں نہیں سمجھتے ہو؟“

مجادلہ کی حقیقت اس کے سوا کچھ اور نہیں ہے کہ جس چیز کو مخالف مقدس اور محترم جانتا ہو اسے استدلال کی بنیاد قرار دیکر مخالف کو اسی کے اعتقاد کے ذریعہ شکست دی جائے۔ اس لحاظ سے، یہ خط ہرگز اس بات کی دلیل نہیں ہے کہ امام علیہ السلام مہاجرین و انصار کی شورئی کے ذریعہ خلیفہ کے انتخاب کو سو فیصد صحیح جانتے تھے اور امام کا عقیدہ بھی یہی تھا کہ خلیفہ کا انتخاب مہاجرین و انصار کی مشورت کے ذریعہ ہی انجام پانا چاہئے اور مسئلہ امامت ہرگز ایک انتصابی مسئلہ نہیں بلکہ انتحابی مسئلہ ہے۔

اگر امام علیہ السلام کا مقصد یہی ہوتا، تو انہیں اپنے خط کو گذشتہ تین خلفاء کی بیعت کی گفتگو سے شروع نہیں کرنا چاہئے تھا، بلکہ انہیں ان خلفاء کی خلافت کی طرف اشارہ کئے بغیر اپنی بات کو یوں شروع کرنا چاہئے تھا:

”مہاجرین و انصار نے میری بیعت کی ہے اور جس شخص کی وہ بیعت کر لیں وہ لوگوں کا امام و پیشوا ہوگا“

یہ جو امام بعد والے جملوں میں فرماتے ہیں: ”فان اجتمعوا علی رجل و سموہ اماماً، کان ذلک (لله) رضا“ تو یہ احتجاج بھی مخالف کے عقیدہ کی روشنی میں ہے اور کلمہ ”اللہ“ نہج البلاغہ کے صحیح نسخوں میں موجود نہیں ہے بلکہ مصرع میں چھپے نسخوں میں بریکٹ کے اندر پایا جاتا ہے (اور یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ امام کے خط میں اس کلمہ (اللہ) کے ہونے میں شک پایا جاتا ہے) حقیقت میں امام فرماتے ہیں کہ: اگر مسلمان اپنے پیشوا کے انتخاب میں ایک فرد پر اتفاق کریں، تو ایسا کام پسندیدہ ہے، یعنی تم لوگوں کے عقیدہ کے مطابق یہ کام پسندیدہ اور رضامندی کا باعث ہے اور یہی کام تو میرے بارے میں انجام پایا ہے، اب کیوں میری بیعت کرنے میں مخالفت

کرتے ہو؟

سب سے پہلا شخص، جس نے اس خطبہ سے اہل سنت کے نظریہ کو ثابت کرنے کے سلسلہ میں استدلال کیا ہے، شارح نصح البلاغہ، ابن ابی الحدید، ہے۔ اس نے اس خط میں اور نصح البلاغہ کے دیگر خطبوں میں موجود قرآن کے سلسلہ میں غفلت کے سبب اس سے اہل سنت کے نظریہ کی حقانیت پر استدلال کیا ہے اور امامؑ کے فرمائشات کو ایک سنجیدہ امر سمجھتے ہوئے اسے آپؐ کا عقیدہ تصور کیا ہے^۱۔ شیعہ علماء جب بھی اس خطبہ کی شرح پر پہنچتے ہیں تو انہوں نے وہی مطلب بیان کیا ہے جس کا ہم اوپر اشارہ کر چکے۔

تعجب ہے کہ احمد کسروی نے اپنی بعض تحریروں میں اس خطبہ کو بنیاد بنا کر اسے شیعوں کے عقیدہ کے بے بنیاد ہونے کی دلیل قرار دیا ہے اور اس سے بڑھ کر تعجب ان لوگوں پر ہے جو ان دو افراد کی باتوں کو نیا روپ دیگر اسے دھوکہ کھانے والوں کے بازار میں ایک نئی چیز کے طور پر پیش کرتے ہیں اور یہ نہیں جانتے کہ ہر زمانے میں مذہب تشیع کے ایسے محافظ موجود ہوتے ہیں جو خود غرضوں کی سازشوں کا پردہ چاک کر دیتے ہیں۔

یک طرفہ فیصلہ نہ کریں!

کسی فیصلہ کیلئے خود مری سے کام نہیں لینا چاہئے اور ”نصح البلاغہ“ میں موجود امامؑ کے دوسرے ارشادات سے چشم پوشی نہیں کرنا چاہئے، بلکہ امام علیہ السلام کے تمام بیانات سے استفادہ کر کے ایک نتیجہ اخذ کرنا چاہئے۔

یہی امام جو اس خط میں لکھتے ہیں:

”جن لوگوں نے گذشتہ تین خلفا کی بیعت کی تھی، انہوں نے میری بھی بیعت کی ہے اور

۱۔ شرح نصح البلاغہ ابن ابی الحدید ج ۱۳، ص ۳۶۔

جب کبھی مہاجر و انصار کسی کی امامت کے بارے میں اتفاق رائے کا اظہار کریں، تو وہ لوگوں کا پیشوا ہوگا اور کسی کو اس کی مخالفت کرنے کا حق نہیں ہے۔“

خلافت خلفاء کے بارے میں خطبہ رشتہ شقیہ میں فرماتے ہیں:

”خدا کی قسم! فرزند ابوقحافہ نے پیراہنِ خلافت کو کھینچنا کر پہن لیا حالانکہ وہ میرے بارے میں اچھی طرح جانتا تھا خلافت کی پچھلی میرے وجود کے گرد گردش کرتی ہے اور میرا خلافت میں وہی مقام ہے جو پچھلی کے اندر اس کی کیل کا ہوتا ہے۔ میں وہ (کوہ بلند) ہوں جس سے علوم و معارف کا سیلاب نیچے کی طرف جاری ہے اور کسی کے وہم و خیال کا پرندہ بھی مجھ تک نہیں پہنچ سکتا۔ لیکن میں نے جامہ خلافت کو چھوڑ دیا اور اس سے پہلو تہی کر لی اور سوچنا شروع کیا کہ اپنے کئے ہوئے ہاتھوں (کسی ناصر و مددگار کے بغیر) سے حملہ کروں یا اس سے بھیا تک تیرگی پر صبر کر لوں، جس میں سن رسیدہ بالکل ضعیف اور بچہ بوڑھا ہو جاتا ہے اور مؤمن اس میں رنجیدہ ہوتا ہے یہاں تک کہ وہ اپنے پروردگار کے پاس پہنچ جاتا ہے مجھے اس اندھیر پر صبر ہی قرین عقل نظر آیا۔ لہذا میں نے صبر کیا حالانکہ آنکھوں میں (غم و اندوہ کے منکے کی) خلش تھی اور حلق میں (غم و رنج کی) ہڈی پھنسی ہوئی تھی۔ میں اپنی میراث کو لٹتے دیکھ رہا تھا، یہاں تک کہ پہلے (ابوبکر) نے اپنی راہ لی اور وہ اپنے بعد خلافت این خطاب کو دے گیا۔ تعجب ہے کہ وہ زندگی میں تو خلافت سے سبکدوش ہونا چاہتا تھا۔ لیکن اپنے مرنے کے بعد اس کی بنیاد دوسرے کیلئے استوار کرتا گیا۔ ان دونوں نے خلافت کو دو پستانوں کے مانند آپس میں بانٹ لیا اس نے خلافت کو ایک سخت و درشت جگہ قرار دے دیا۔

آپ نے مزید فرمایا:

”... یہاں تک کہ دوسرا (عمر) بھی اپنی راہ لگا، اور اس نے خلافت کا معاملہ ایک جماعت

کے حوالے کر دیا۔ اور مجھے بھی اس جماعت کا ایک فرد قرار دیا۔ اے اللہ! میں تجھ سے اس شوریٰ کی تشکیل اور اس کے مشورہ سے پناہ مانگتا ہوں جبکہ انہوں نے مجھے بھی اس کا ہم ردیف قرار دے دیا.....“^۱

امام علیہ السلام اپنے ایک خط میں اپنی مظلومیت اور آپ سے بیعت لینے کے طریقے پر سد پر وہ اٹھاتے ہوئے معاویہ کے ایک خط کے جواب میں۔ جس میں اس نے حضرت کو لکھا تھا کہ انہیں اونٹ کی ناک میں ٹکیل ڈال کر کھینچنے کی صورت میں ابو بکر کی بیعت کرنے کیلئے کھینچ کر لے گئے تھے۔ لکھتے ہیں:

”تم نے لکھا تھا کہ: مجھے اونٹ کی ناک میں ٹکیل ڈال کر کھینچنے کی صورت میں بیعت کرنے کیلئے کھینچ کر لے گئے تاکہ میں بیعت کروں۔ خدا کی قسم تم نے چاہا کہ میری ملامت کرو لیکن اس کے بجائے تم میری ستائش کر گئے ہو اور مجھے رسوا کرنا چاہتے تھے لیکن خود رسوا ہو گئے ہو (کیونکہ تم میری مظلومیت کا واضح طور پر اعتراف کر گئے ہو) کیونکہ مسلمان کیلئے۔ جب تک اس کے دین میں شک اور یقین میں خلل نہ ہو۔ مظلومیت اور ظلم و ستم سہنے میں کوئی عار نہیں ہے“^۲

کیا امامؑ کی اپنی مظلومیت کے بارے میں اس صراحت کے باوجود کہ آپ سے زور زبردستی اور جبراً بیعت لی گئی ہے، یہ تصور کیا جا سکتا ہے کہ آپ نے خلفاء کی خلافت کی تائید کی ہوگی اور ان کو امت کے امام و پیشوا کے طور پر تسلیم کیا ہوگا؟ ہرگز نہیں، لہذا اس سے ثابت ہوتا ہے کہ زیر بحث خط میں آپ کا مقصد مجادلہ اور طرف کو لا جواب کرنا تھا۔

۱۔ شرح صحیح البیہقی، ج ۱، خطبہ ششمینہ۔

۲۔ و قتل انی کنت افاد کما یقاد الجمل المحشوس حتی اباع و لعمر اللہ لقد اردت ان تدم فمدحت و ان تمضح فافضحت و علی المسلم من غضاضة فی ان یکون مظلوماً ما لم یکن شاکاً فی دینہ و لا مرتاباً ببقینہ“ (صحیح البیہقی، خطبہ ۲۸)

امام علیہ السلام اپنے ایک اور خط میں — جسے آپؑ نے اپنے گورنر مالک کے ہاتھ مصر بھیجا تھا — لکھتے ہیں:

”خدا کی قسم! میں کبھی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ عرب پیغمبرؐ کے بعد خلافت کو آپ کے خاندان سے نکال کر کسی دوسرے کو سونپ دیں گے اور ہمیں اس سے محروم کر دیں گے۔ ابو بکر کی بیعت کیلئے لوگوں کی پیشقدمی نے ہمیں رنج و مصیبت میں ڈال دیا“۔

۱۔ ”و لا یخطر ببالی ان العرب ترعج هذا الأمر من بعده صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم عن اہل بیتہ ولا انہم مسجورہ عنی من بعده فما راعنی الا انبئال الناس علی فلان یا بعونہ.....“ (کنج البلاغ، خط ۶۳)

گیارہویں فصل

سقیفہ بنی ساعدہ کی غم انگیز داستان

پیغمبرؐ کی تشویش کہیں امت جاہلیت کی طرف پلٹ نہ جائے!

قرآن مجید کی آیات اور تاریخی قرائن اس امر کے شاہد ہیں کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اسلامی معاشرے کے مستقبل کے بارے میں سخت فکر مند تھے۔ اور (غیبی الہامات سے قطع نظر) بعض سلسلہ وار ناگوار حوادث کو دیکھتے ہوئے آپؐ کے ذہن میں یہ احتمال تقویت پا رہا تھا کہ ممکن ہے ایک گروہ یا بہت سے لوگ آپؐ کی رحلت کے بعد جاہلیت کے زمانے کی طرف پلٹ جائیں اور سنن الہی کو پس پشت ڈال دیں۔

اس احتمال اور خدشہ نے اس وقت آپؐ کے ذہن میں اور زیادہ قوت پائی جب آپؐ نے جنگ احد میں (جب دشمن کی طرف سے پیغمبر اسلامؐ کے قتل ہونے کی افواہ پھیلانی لگی تھی) اس بات کا عینی مشاہدہ کیا کہ مسلمانوں کی اکثریت نے بھاگ کر پہاڑوں اور دروازوں علاقوں میں پناہ لے لی۔ اور بعض لوگوں نے فیصلہ کر لیا کہ منافقوں کے سردار ”عبداللہ ابن ابی“ کے ذریعہ ابوسفیان سے امان حاصل کریں۔ اتنا ہی نہیں بلکہ ان لوگوں کا مذہبی عقیدہ اتنا کمزور اور متزلزل ہوا تھا کہ وہ خدا کے بارے میں بدگمان ہو کر جاہلانہ افکار کے مرتکب ہو گئے تھے۔ قرآن مجید نے اس راز کا یوں پردہ چاک کیا ہے:

﴿وَ طَائِفَةٌ قَدْ أَهَمَّتْهُمْ أَنْفُسُهُمْ يَظُنُّونَ بِاللَّهِ غَيْرَ الْحَقِّ ظَنَّ الْجَاهِلِيَّةِ يَقُولُونَ

هَلْ لَنَا مِنَ الْأَمْرِ شَيْءٌ ﴿۱﴾

(اصحاب پیغمبر میں سے ایک گروہ کو) اپنی جان کی اس قدر فکر تھی کہ وہ خدا کے بارے میں دوران جاہلیت کے جیسے باطل خیالات کے مرتکب ہو گئے تھے اور وہ یہ کہہ رہے تھے کہ آیا (مسلمین پر جاہلیت) جیسی کوئی چیز ہم پر ہے؟

قرآن مجید ایک اور آئیہ کریمہ میں اصحاب رسول خداؐ کے آپسی اختلافات کے بارے میں اشارتا خبر دیتے ہوئے فرماتا ہے:

﴿ وَ مَا مُحَمَّدٌ إِلَّا رَسُولٌ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ أَفَإِنْ مَاتَ أَوْ قُتِلَ انْقَلَبْتُمْ عَلَىٰ أَعْقَابِكُمْ وَ مَنْ يَنْقَلِبْ عَلَىٰ عَقْبَيْهِ فَلَنْ يَضُرَّ اللَّهَ شَيْئًا وَ سَيَجْزِي اللَّهُ الشَّاكِرِينَ ﴿۲﴾

”اور محمدؐ تو صرف خدا کی جانب سے ایک رسول ہیں جن سے پہلے بہت سے رسول گذر چکے ہیں کیا اگر وہ مر جائیں یا قتل ہو جائیں تو تم اٹلے پیر پلٹ جاؤ گے؟ تو جو بھی ایسا کرے گا وہ خدا کا کوئی نقصان نہیں کرے گا اور خدا عنقریب شکر گزاروں کو ان کی جزا دے گا۔“

یہ آئیہ شریفہ اصحاب رسول خداؐ کو دو حصوں یعنی عصر جاہلیت کی طرف لوٹ جانے والے اور ”ثابت قدم و شکر گزار“ گروہ میں تقسیم کر کے اشارتا یہ بیان کرتی ہے کہ پیغمبر اسلام کی رحلت کے بعد مسلمان افتراق و اختلاف کے شکار ہو کر دو گروہ میں بٹ جائیں گے ایک گروہ عصر جاہلیت کی طرف پلٹ جائے گا اور دوسرا گروہ ثابت قدم و شکر گزار رہے گا۔

کیا عقل اس بات کی اجازت دیتی ہے کہ پیغمبر اسلام ایک ایسی امت کو جو اختلاف و افتراق سے دو چار ہو، اپنے حال پر چھوڑ دیں اور ان کیلئے ایک امام و پیشوا اور حاکم و فرمان روا مقرر نہ

۱۔ آل عمران/۱۵۳۔

۲۔ آل عمران/۱۳۳۔

فرمائیں؟

پیغمبر ﷺ کیلئے یا قومی اتحاد کے قائل افراد کیلئے بھی یہ ہرگز جائز نہیں کہ ایک ایسے لوگوں کی اجتماعی و سیاسی زندگی کی باگ ڈور خود ان کے ہاتھ میں دیدیں، بلکہ حالات پر قابو رکھنے کیلئے لازم بن جاتا ہے کہ ایک لائق اور قابل شخص کو امت کے امام و پیشوا کی حیثیت سے مقرر کیا جائے تاکہ حتی الامکان اختلاف و افتراق اور ناامنی سے معاشرے کو بچایا جاسکے۔

پیغمبر اسلام جانتے تھے کہ آپ کی امت میں اختلاف و افتراق پایا جاتا ہے اور یہ امت بھی گزشتہ امتوں کی طرح مختلف گروہوں میں بٹ جائے گی، حتیٰ آپ نے اپنی امت کے بارے میں پیشینگوئی کے ذریعہ فرمایا ہے:

”ستفترق امتی علی ثلاث و سبعین فرقة، فرقة ناجية و الباقون فی النار“

عنقریب میری امت ۳۷ فرقوں میں بٹ جائے گی ان میں سے صرف ایک گروہ اہل نجات ہوگا اور باقی فرقے جہنمی ہوں گے!

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اطلاع و آگاہی رکھنے کے باوجود کہ امت کی رہبری کا انتخاب بہت سے اختلافات کا سدباب بن سکتا ہے کس طرح اس اہم امر کو ایک قلموں مزاج جمعیت کے سپرد کیا، جس کے نتیجے میں امت میں یہ وسیع اختلافات و شکاف پیدا ہو گیا؟!

اسلامی سماج، ان دنوں مختلف گروہوں میں بٹ گیا تھا اور ہر گروہ ایک آرزو اور مقصد رکھتا تھا: انصار و معروف گروہوں یعنی ”اوس“ و ”خزرج“ پر مشتمل تھے، اور مہاجر، بنی ہاشم اور بنی امیہ کے علاوہ قبائل ”تیم“ اور ”عدی“ پر مشتمل تھے۔ ہر گروہ چاہتا تھا معاشرے کی قیادت اس کے ہاتھ میں

آجائے اور ان کے قبیلہ کا سردار اس عہدہ کا مالک بنے۔

کیا ان متضاد گروہوں کے ہوتے ہوئے امت میں اتحاد و یکجہتی اور دین کے سلسلے میں مسلمانوں کے استحکام و پائیداری کی امید کی جاسکتی ہے یا سب سے پہلے اختلاف و افتراق کے اسباب کو جڑ سے اکھاڑ دینا چاہیے تب ایسی امید رکھنی چاہئے؟

پیغمبر اسلامؐ کی رحلت کے بعد مسلمانوں کی صفوں میں جو سب سے بڑی دراڑ پیدا ہوئی اور جس سے ان کے اتحاد و یکجہتی پر کاری ضرب لگی وہ اسلامی قیادت کے بارے میں اختلاف نظر کا سبب تھا۔ اگر مسلمان اس موضوع پر اختلاف و افتراق کے شکار نہ ہوتے تو بہت سے اختلافات قیادت کے مسئلہ میں اتفاق نظر اور اتحاد کی وجہ سے حل ہو جاتے۔ لیکن اسی اہم اور بنیادی امر پر اختلاف ہی بعد والے اختلافات، جنگوں اور فتنوں کا سبب بنا نتیجہ کے طور پر امت مختلف گروہوں اور جماعتوں میں تقسیم ہو گئی اور بعض گروہ ایک دوسرے کی مخالفت اور ٹکراؤ پر اتر آئے۔

اہل سقیفہ کی منطق

قرآن مجید یا ران پیغمبرؐ کو تسمیہ کرتا ہے کہ مبادا آپؐ کی رحلت کے بعد وہ زمانہ جاہلیت کے افکار کی طرف پلٹ جائیں۔

سقیفہ بنی ساعدہ میں جمع ہوئے گروہ کی سرگزشت کی تحقیقات اور مطالعہ سے بخوبی معلوم ہوتا ہے کہ کس طرح اس دن پوشیدہ اسرار اور کینہ و عداوت سے پردے اٹھ گئے اور اصحاب رسولؐ کی گفتگو میں ایک بار پھر قومی اور قبیلہ ای تعصبات اور جاہلیت کے افکار رونما ہوئے اور واضح ہو گیا کہ اسلامی تربیت نے ابھی بہت سے اصحاب رسولؐ کے دلوں کی گہرائیوں تک رسوخ نہیں کیا تھا اور اسلام، جاہلیت کے منحوس چہرے پر ایک نقاب کے علاوہ کچھ نہ تھا۔

اس تاریخی واقعہ کے مطالعہ اور تحقیق سے بخوبی معلوم ہوتا ہے کہ اس اجتماع کا مقصد کیا تھا، جھگڑالوں، تقریروں، ایک دوسرے پر حملوں کا مقصد ذاتی منفعت طلبی اور سود جوئی کے سوا کچھ نہ

تھا۔ ہر شخص خلافت کا لباس شائستہ ترین شخص کو پہنانے کے بجائے اپنے بدن پر زیب تن کرنے کی کوشش میں تھا، اور جو موضوع اس مجلس میں زیر بحث نہ آیا وہ اسلام اور مسلمانوں کی مصلحت عامہ یا اس منصب کیلئے ایک شائستہ ترین فرد کی تلاش کرنا تھا، جو عقلمندانہ تدبیر، وسیع علم، عظیم روح اور پسندیدہ اخلاق سے اسلام کی ذہنی کشتی کو ساحل تک پہنچانے میں قیادت کے فرائض انجام دیتا۔

حادثہ سقیفہ کے مطالعہ و تجزیہ سے بخوبی پتا چلتا ہے کہ سقیفہ کے ہدایت کار اپنے اور اپنے منافع کے علاوہ کوئی اور فکر نہیں رکھتے تھے اور ہر شخص اپنا الوسیدھا کرنے کی فکر میں تھا۔

تاریخی المیہ!

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا جسد اطہر ابھی زمین پر تھا، بنی ہاشم اور آنحضرتؐ کے بعض سچے اصحاب، پیغمبر اسلامؐ کی تجہیز و تکفین کے مقدمات میں مصروف تھے کہ اچانک انصار کا گروہ پیغمبر اسلامؐ کے گھر سے چند قدم کی دوری پر ”سقیفہ بنی ساعدہ“ نام کے ایک سائبان کے نیچے جمع ہوا تاکہ پیغمبر اکرمؐ کا خلیفہ و جانشین مقرر کرے۔ گویا ان لوگوں کی نظر میں خلیفہ کا تقرر پیغمبر اسلامؐ کی تجہیز و تکفین و تدفین سے انتہائی فوری اور اہم مسئلہ تھا!۔

جس وقت حضرت علیؑ علیہ السلام بنی ہاشم اور مہاجرین کے ایک گروہ کے ہمراہ گھر کے اندر اور اس کے باہر پیغمبر اسلامؐ کی نماز جنازہ اور تدفین کی تیاریوں میں مصروف تھے، اچانک حضرت عمرؓ نے جو گھر کے باہر تھے، انصار کے سقیفہ میں جمع ہونے کی خبر سنی۔ کسی کے ذریعہ فوراً حضرت ابو بکرؓ کو اطلاع دی کہ جتنی جلد ہو سکے گھر سے باہر آئے۔ حضرت ابو بکرؓ حضرت عمرؓ کے بلاوے کے سبب سے آگاہ نہ تھے اس لئے عذر خواہی کے ساتھ جواب دیا کہ: ”میں یہاں پر کام میں مصروف ہوں لیکن آخر کار حضرت عمرؓ کے اصرار پر مجبور ہو کر گھر اور پیغمبرؐ کے جسد اطہر کو چھوڑ کر باہر آئے۔ جب وہ بھی حضرت عمرؓ کی طرح ماجرا سے آگاہ ہوئے تو انہوں نے بھی سب کچھ چھوڑ کر سقیفہ کی راہ لی۔ دونوں سقیفہ کی طرف چلے اور ابو عبیدہ ابن جراحؓ کو بھی اپنے ساتھ لئے گئے۔ اب ذرا غور سے طرفین کے

مناظرہ اور استدلال کو سنیے کہ یہ لوگ کس منطق کے تحت خود کو اور اپنے قبیلہ کو خلافت کیلئے دوسرے سے لائق و شائستہ سمجھتے تھے۔

اس جلسہ میں انصار کے ترجمان سعد بن عبادہ اور حباب بن منذر تھے اور مہاجرین کی ترجمانی کا فریضہ ابو بکر، عمر اور ابو عبیدہ انجام دے رہے تھے، آخر میں انصار کی طرف سے بھی دو افراد نے سعد بن عبادہ کے کام میں روڑے اٹکانے کیلئے تقریریں کی۔ اب پورا قضیہ ملاحظہ ہو:

سعد (انصار سے مخاطب ہو کر): تم لوگ ایسی فضیلت اور برتری کے مالک ہو کہ دوسرے اس سے محروم ہیں، پیغمبر گرامیؐ نے ساہا سال اپنے لوگوں کو توحید کی دعوت دی، لیکن چند لوگوں کے علاوہ کوئی آپؐ پر ایمان نہ لایا اور وہ بھی آپؐ کا دفاع کرنے کی طاقت نہیں رکھتے تھے۔ لیکن تم لوگ انصار! آنحضرتؐ پر ایمان لائے آنحضرتؐ اور آپؐ کے اصحاب کا دفاع کیا۔ آپؐ کے دشمنوں سے جنگ لڑی جس کے نتیجے میں لوگوں نے آپؐ کا دین قبول کیا۔ یہ تم لوگوں کی تلواریں تھیں جس کی وجہ سے عرب آنحضرتؐ کے سامنے ہتھیار ڈالنے پر مجبور ہوئے۔ جب پیغمبر اسلامؐ اس دنیا سے رخصت ہوئے تو تم لوگوں سے راضی اور پر امید تھے اس لحاظ سے ضروری ہے کہ امر خلافت کی باگ ڈور اپنے ہاتھوں میں لے لو کیونکہ تم لوگ اس امر میں تمام لوگوں سے شائستہ اور بہتر ہو۔

سعد کی منطق یہ تھی، چونکہ ہم نے پیغمبرؐ اور آپؐ کے اصحاب کو پناہ دی ہے، آپؐ اور آپؐ کے اصحاب کا دفاع کیا ہے اور آپؐ کے دشمنوں سے جنگ لڑی ہے اس لئے ہم قیادت کی باگ ڈور اپنے ہاتھوں میں لینے میں دوسروں سے سزاوار اور لائق ہیں۔

اب دیکھئے کہ اس کے مقابلے میں مہاجرین کی منطق کیا تھی؟

حضرت ابو بکر: مہاجرین اولین گروہ ہیں جو دین پیغمبرؐ پر ایمان لائے اور اس فضیلت پر

افتخار کرتے ہیں۔ انہوں نے مشکلات اور سختیوں میں صبر و تحمل سے کام لیا ہے، افراد کی کمی پر نہیں ڈرے ہیں، دشمنوں کی اذیتوں کو برداشت کیا ہے اور آنحضرتؐ پر ایمان اور آپؐ کے دین سے منہ نہیں موڑا۔ ہم، آپ، انصار کے فضائل اور خدمات سے ہرگز انکار نہیں کرتے اور بے شک مہاجرین کے بعد دیگر لوگوں پر آپؐ فضیلت اور برتری رکھتے ہیں۔ اس لئے قیادت و رہبری کی باگ ڈور مہاجرین کے ہاتھ اور وزارت آپؐ لوگوں کے ہاتھ میں ہوگی اور ہم حاکم ہوں گے اور آپؐ وزیر اور کوئی بھی کام آپؐ لوگوں کے مشورہ کے بغیر انجام نہیں پائے گا۔

مہاجرین کی برتری کا استدلال یہ تھا کہ وہ سب سے پہلے پیغمبرؐ پر ایمان لائے ہیں اور آپؐ کے دین کو قبول کیا ہے۔

حباب بن منذر: اے جماعت انصار! حکومت کی باگ ڈور کو اپنے ہاتھ میں لے لو۔ دوسرے لوگ تمہاری ہی قدرت کے سائے میں زندگی بسر کرتے ہیں اور کوئی تمہارے خلاف کوئی قدم اٹھانے کی جرأت نہیں کر سکتا تم لوگ صاحب قدرت ہو اور تعداد میں بھی زیادہ ہو۔ اپنی صفوں میں ہرگز اختلاف و تفرقہ پیدا نہ ہونے دو، اختلاف کی صورت میں تباہی اور بردباری کے سوا کوئی نتیجہ نہ ہوگا۔ اگر مہاجرین نے اقتدار پر قبضہ کرنے پر اصرار کیا تو ہم مسئلہ کو ”دوامیر“ کے طریقے سے حل کریں گے اور ایک قائد اور حاکم ہم میں سے اور ایک حاکم ان میں سے مقرر ہوگا۔

اس مناظرہ میں انصار کی منطق افراد کی کثرت اور ان کے دھڑے کی طاقت پر منحصر ہے۔ وہ

۱۔ الامت والسیاتہ ج ۱ ص ۵۔

۲۔ انصار نے دو امیروں کی تجویز پیش کر کے اپنے ہیروں پر گہاڑی ماری۔ اس مقابلہ میں ایک قدم پیچھے ہٹے اور مہاجرین کے مقابلے میں اپنے ضعف و کمزوری کا اعتراف کیا۔ اس لئے جب قبیلہ خزرج کے سردار نے ”حباب“ سے یہ بات سنی تو انتہائی افسوس کے ساتھ بول اٹھا: ہذا اول الوہن، یہ تجویز ہماری کمزوری کی نشانی ہے

کہتے ہیں چونکہ ہم طاقتور ہیں اس لئے حاکم ہم میں سے ہونا چاہئے۔

حضرت عمر: ایک غلاف میں ہرگز دتلواریں نہیں سما سکتی ہیں۔ خدا کی قسم عرب تم لوگوں کی فرمانروائی کے سامنے ہرگز تسلیم نہیں ہوں گے کیونکہ ان کا پیغمبر آپ لوگوں میں سے نہیں ہے۔ لیکن اگر حکومت پیغمبر کے کسی رشتہ دار کے ہاتھ آئے تو عرب کو اس پر اعتراض نہیں ہوگا۔ کس کی جرأت ہے کہ اس حکومت کے بارے میں ہمارا مقابلہ کرے اور ہم سے لڑے جس کی داغ بیل حضرت محمدؐ نے ڈالی ہے، جب کہ ہم آپ کے رشتہ دار ہیں۔

اس گفتگو میں حضرت عمر نے زمام حکومت کو ہاتھ میں لینے کا معیار پیغمبر کے ساتھ اپنی رشتہ داری اور قرابت کو قرار دیا اور اس طرح مہاجر اور ان میں قبیلہ قریش کو خلافت کیلئے شائستہ و حقدار جتلا یا ہے۔^۱

”حباب بن منذر“ نے ایک بار پھر انصار کی طاقت کا سہارا لیتے ہوئے کہا:

اے انصار کی جماعت! عمر اور اس کے ہم فکروں کی بات پر کان نہ دھرو وہ تم لوگوں سے قیادت اور فرمان روائی چھیننا چاہتے ہیں۔ اگر انہوں نے ہماری بات نہ مانی تو ان سب کو اس سرزمین سے نکال باہر کرو تم لوگ اس کام (فرمانروائی) کیلئے دوسرے لوگوں سے زیادہ شائستہ ہو۔ تم ہی لوگوں کی تلواروں کی جھنکار کے نتیجے میں لوگوں نے یہ دین قبول کیا ہے۔

عمر: خدا تجھے موت دے

حباب: خدا تجھے موت دے۔

ابو عبیدہ نے گویا انصار کو ایک رشوت دیتے ہوئے مہاجرین کو حکومت دیئے جانے کی یوں

تائید کی:

اے انصار کی جماعت! تم لوگ وہ پہلے افراد تھے جنہوں نے پیغمبر اسلام کی حمایت اور

۱۔ آئندہ بحث میں اس سلسلے میں امیر المؤمنین کی تنقید بیان ہوگی۔

مدد کی اب یہ ہرگز سزاوار نہیں ہے کہ تم ہی لوگ سب سے پہلے پیغمبر کی سنت کو بھی بدل

دو۔

یہاں پر انصار میں سے سعد بن عبادہ (جو خلافت کیلئے انصار میں سے تقریباً آدھے لوگوں کا امیدوار تھا) کا چچیرا بھائی بشیر بن سعد، اٹھ کھڑا ہوا، امید تھی وہ انصار کے حق میں بول کر قضیہ کو ختم کر دے گا لیکن اس نے اس کے برخلاف، سعد بن عبادہ کے ساتھ اپنی دیرینہ عداوت کی وجہ سے حضرت عمر کے استدلال کی تائید کی اور اپنے رشتہ داروں کی طرف مڑ کر کہا:

محمدؐ قریش میں سے ہیں اور آپ کے رشتہ دار خلافت کیلئے دوسروں سے اولیٰ اور شائستہ ہیں، میں یہ ہرگز نہیں دیکھنا چاہتا کہ آپ لوگ اس مسئلے میں ان سے ٹکرائیں۔
طرفین نے اپنی اپنی بات سنادی اور کوئی دوسرے کو مطمئن نہ کر سکا تو حضرت ابو بکر نے موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ایک تجربہ کار سیاستدان کی طرح ایک نئی تجویز پیش کی اور ایک قدم آگے بڑھاتے ہوئے یہ فیصلہ کیا کہ دو آدمیوں کو پیش کرے تاکہ لوگ ان دونوں میں سے ایک کی بیعت کر لیں، خاص کر انہوں نے مشاہدہ کیا کہ انصار میں اتفاق رائے نہیں ہے اور بشیر بن سعد، سعد بن عبادہ (قبیلہ خزرج کے سردار) کا مخالف ہے۔

اس لئے ایک خاص انداز میں بحث و مباحثہ کو ختم کرتے ہوئے بولے:

”میری درخواست ہے کہ مہربانی کر کے اختلاف و تفرقہ سے پرہیز کیجئے میں آپ لوگوں کا خیر خواہ ہوں، بہتر ہے بات کو مختصر کیجئے اور عمرو ابو عبیدہ میں سے کسی ایک کی بیعت کر لیجئے“

عمرو ابو عبیدہ دونوں نے کہا:

ہمارے لئے ہرگز یہ مناسب نہیں ہے کہ آپ جیسی شخصیت کے ہوئے ہوئے حکومت و خلافت کی باگ ڈور ہم اپنے ہاتھ میں لے لیں۔ مہاجرین میں سے کوئی بھی آپ کے

براہر نہیں ہے۔ آپ غار ثور میں پیغمبرؐ کے ہم نشین تھے، آپ نے پیغمبرؐ کی جگہ پر نماز پڑھائی ہے اور آپ کی مالی حالت بھی بہتر ہے، اپنے ہاتھ کو آگے بڑھائے تاکہ ہم آپ کی بیعت کریں۔

یہاں پر حضرت ابو بکر نے بلا کسی تکلف کے بغیر کچھ کہے اپنا ہاتھ پھیلا دیا اور دل میں موجود راز سے پردہ اٹھا دیا، اور یہ بات کھل گئی کہ عمر اور ابو عبیدہ کو آگے بڑھانے کا مقصد اپنے لئے راہ ہموار کرنے کے علاوہ کچھ اور نہ تھا۔

لیکن اس سے پہلے کہ عمر، ابو بکر کے ہاتھ پر بیعت کرے، بشیر بن سعد نے سبقت کی اور حضرت ابو بکر کے ہاتھ پر دوسروں سے پہلے بیعت کی۔ اس کے بعد عمر اور ابو عبیدہ نے بھی جانشین رسول کی حیثیت سے حضرت ابو بکر کی بیعت کی۔ اسی وقت گروہ انصار میں وہ گہری دراڑ پڑ گئی جس کا امکان بشیر کی تقریر کے بعد پیدا ہو چکا تھا۔ اس طرح انصار کی ناکامی قطعی ہو گئی۔

حباب بن منذر، بشیر کی بیعت (جو خود انصار میں سے تھا) پر آگ بگولا ہو گیا اور فریاد بلند کرتے ہوئے بولا: بشیر! تم نے نمک حرامی کی اور اپنے پیچیرے بھائی سے رشک کی بنا پر اسے حاکم بننے نہیں دیا۔

بشیر نے کہا:

ہرگز ایسا نہیں ہے بلکہ میں یہ نہیں چاہتا تھا کہ خدا نے جو حق گروہ مہاجر کیلئے مخصوص کیا تھا، اس پر جھگڑا برپا کروں۔

”اسید بن حنیفہ“ قبیلہ اوس کا سردار۔ جس کے دل میں ابھی بھی خنزرج کے سردار کی طرف

سے کینہ تھا۔ اٹھا اور اپنے قبیلہ سے مخاطب ہو کر بولا:

اٹھو اور ابو بکر کی بیعت کرو، کیونکہ اگر سعد حکومت کی باگ ڈور اپنے ہاتھ میں لے لے گا تو قبیلہ خنزرج ہم پر ایک قسم کی برتری پیدا کر لے گا اس پر قبیلہ اوس نے بھی اپنے سردار کے

حکم سے حضرت ابو بکر کی بیعت کر لی۔

اس موقع پر سیدھے سادھے لوگوں کی جماعت جن میں فکری شعور نہیں پایا جاتا اور جو اپنے سردار کے حکم کی پیروی کرتے ہوئے حضرت ابو بکر کی بیعت کیلئے اس طرح آگے بڑھے کہ سعد قدموں تلے روند ڈالا گیا۔

ایک نامعلوم شخص نے پکارتے ہوئے کہا:

خزرج کا سردار پیروں تلے روند ڈالا گیا! اس کا خیال کرو!

لیکن حضرت عمر اس بے احترامی سے خوش ہوئے اور کہا:

خدا سے موت دے، کیونکہ ہمارے لئے ابو بکر کی بیعت سے بالاتر کوئی چیز نہیں ہے!

خود حضرت عمر جب بعد میں سقیفہ کا ماجرا بیان کرتے تھے تو حضرت ابو بکر کے حق میں اپنی

بیعت کی وضاحت یوں کرتے تھے:

اگر ہم اس دن نتیجہ حاصل کئے بغیر جلسہ کو ترک دیتے تو ممکن تھا ہمارے چلے جانے کے بعد

انصار اتفاق رائے پیدا کر لیتے اور اپنے لئے کسی قائد کا انتخاب کر لیتے۔

بالآخر سقیفہ کا جلسہ بیان شدہ صورت میں خلافت کیلئے حضرت ابو بکر کے انتخاب کے اوپر ختم

ہوا اور حضرت ابو بکر مسجد رسولؐ کی طرف بڑھے جبکہ حضرت عمر، ابو عبیدہ اور قبیلہ اوس کا ایک گروہ

انھیں اپنے درمیان میں لئے ہوئے تھا اور سعد بھی اپنے تمام ساتھیوں کے ہمراہ اپنے گھر کی طرف

روانہ ہو گیا!

۱۔ حادثہ سقیفہ کی تفصیلات کو تاریخ طبری ج ۳، (حوادث سال یازدہم) اور الامت والسیاسة، ابن قتیبہ دینوری ج ۱، اور شرح ابن ابی

الجدید ج ۳ ص ۲۲-۶۰ سے نقل کیا گیا ہے۔

بارہویں فصل

انصار اور مہاجرین کی منطق کیا تھی؟

سقیفہ کے واقعہ کے بغور مطالعہ کے بعد اب مناسب ہے کہ اس کے قابل توجہ نکات اور اسے وجود میں لانے والوں کی منطق پر غور کیا جائے۔ اس ”جلسہ“ کے قابل توجہ نکات کا خلاصہ ذیل کے چند امور میں کیا جاسکتا ہے:

۱۔ قرآن مجید کا حکم ہے کہ مؤمن آپس میں جمع ہو کر اپنے مشکلات کی گتھیوں کو تبادلہ خیال کے ذریعہ سلجھائیں۔ اس کے اس گراں بہا حکم کا مقصد یہ ہے کہ عقلمند اور حق پسند لوگوں کی ایک جماعت ایک پرسکون جگہ پر جمع ہوں اور حقیقت پسندانہ نیز تعصب سے عاری غور و فکر کے ذریعہ زندگی کی راہ کو روشن کریں اور مسائل کو حل کریں۔

کیا سقیفہ کے جلسہ میں ایسا رنگ ڈھنگ پایا جاتا تھا؟ اور کیا حقیقت میں اسلامی معاشرے کے عقلا وہاں پر جمع ہوئے تھے کہ خلافت کی گتھی کو گتھوں کے ذریعہ حل کریں؟ یا مطلب اس کے بالکل برعکس تھا؟

اس جلسہ میں مہاجرین میں سے صرف تین افراد حاضر تھے اور ان تین افراد نے دیگر مہاجرین کو اس امر سے مطلع نہیں کیا تھا کہ وہ یہ کام انجام دینے جا رہے ہیں۔ کیا ایسے جلسہ کو جس میں عالم اسلام کی عظیم شخصیتیں، جیسے علی ابن ابیطالب، سلمان فارسی، ابوذر غفاری، مقداد، حذیفہ،

ابی بن کعب، طلحہ وزیر اور ان جیسی دسیوں شخصیتیں موجود نہ ہوں عالم اسلام کیلئے صلاح و مشورہ اور تبادلہ خیال کا جلسہ کہا جاسکتا ہے؟

کیا یہ صحیح تھا کہ ایک ایسے اہم موضوع کے لئے ایک چھوٹی سی میٹنگ پر اکتفا کی جاتی جس میں چیخ و پکار اور داد و فریاد بلندی گئی اور انصار کے امیدوار کو قدموں تلے کچل ڈالا گیا؟! یا یہ کہ ایسے اہم موضوع کے بارے میں کئی جلے منعقد کرنا ضروری تھا جن میں عالم اسلام کی اہم مدبر اور شائستہ شخصیتیں بیٹھ کر اس اہم مسئلہ پر صلاح مشورہ کریں اور بالآخر اتفاق نظر یا اکثریت آراء سے مسلمانوں کا خلیفہ منتخب کیا جاتا؟

اس جلد بازی کے ساتھ حضرت ابو بکر کو خلافت کیلئے منتخب کرنا اس قدر ناچختہ اور خلاف اصول تھا کہ، بعد میں خود حضرت عمر اس سلسلے میں کہتے تھے:

”كانت بيعة ابي بكر فلتة و قى الله شرها فمن دعاكم الى مثلها فاقتلوه“
 ”یعنی خلافت کیلئے ابو بکر کا انتخاب ایک اتفاق سے زیادہ نہیں تھا اور یہ کام صلاح و مشورہ اور تبادلہ خیال کی بنیاد پر انجام نہیں پایا، اب جو کوئی بھی تم لوگوں کو ایسے کام کی دعوت دے، اسے قتل کر ڈالو“

۲۔ دوسرا قابل توجہ نکتہ خود اہل سقیفہ کی منطق ہے۔

گروہ مہاجر کا استدلال غالباً دو چیزوں کے گرد گھوم رہا تھا: ایک ان کا خدا و پیغمبر اسلام پر ایمان لانے میں پیش قدم ہونا اور دوسرا پیغمبر اسلام سے ان کی قرابت و رشتہ داری! اگر ان کی برتری کا معیار یہی دو چیزیں تھیں تو خلافت کیلئے حضرت ابو بکر کو حضرت عمر و ابو عبیدہ کا ہی سہارا نہیں لینا چاہئے تھا، کیونکہ مدینہ میں اس وقت ایسے افراد بھی موجود تھے جو ان دو افراد سے بہت پہلے دین اور توحید پر ایمان لائے تھے اور پیغمبر اسلام سے نزدیکی قرابت بھی رکھتے تھے۔

امیر المؤمنین حضرت علی علیہ السلام پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر ایمان لانے والے پہلے شخص تھے اور پیدائش کے دن سے ہی آپ کے دامن مبارک میں تربیت پائے ہوئے تھے اور رشتہ داری کے لحاظ سے بھی آپ کے چچیرے بھائی اور داماد تھے۔ اس کے باوجود کس طرح ان تین افراد نے خلافت کی گیند کو ایک دوسرے کی طرف پاس دیتے ہوئے بالآخر اسے حضرت ابوبکر کے حوالے کر دیا؟! عمر نے ابوبکر کی برتری کی توجیہ ان کی دولت مندی، غارتوں میں رسول اللہ کی ہمراہی، اور پیغمبر کی جگہ پر نماز پڑھنے کے ذریعہ کی۔

دولت مند ہونے کے بارے میں کیا کہا جائے، یہ وہی ایام جاہلیت کی منطق ہے جب دولت اور ثروت کو برقی و فضیلت کا سبب جانتے تھے۔ مشرکین کا ایک اعتراض یہی تھا کہ یہ قرآن مجید کیوں ایک دولت مند فرد پر نازل نہیں ہوا۔

اگر رسول خدا کے ساتھ غارتوں میں ہمسفر ہونا خلافت کیلئے شائستگی اور معیار ہو سکتا ہے تو امیر المؤمنین کو خلافت کیلئے اس سے بھی زیادہ شائستہ و حقدار ہونا چاہئے۔ کیونکہ آپ شب ہجرت اپنی جان پر کھیل کر پیغمبر اسلام کے بستر پر سوئے تھے مفسرین کا اتفاق ہے کہ درج ذیل آیت آپ کے بارے میں نازل ہوئی ہے:

﴿وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَشْرِي نَفْسَهُ ابْتِغَاءَ مَرْضَاتِ اللَّهِ وَاللَّهُ ذُو الْبُعْدِ﴾

اور لوگوں میں وہ بھی ہیں جو اپنے نفس کو مرضی پروردگار کے لئے بیچ ڈالتے ہیں اور اللہ اپنے بندوں پر بڑا مہربان ہے۔^۲

آنحضرت کی بیماری کے دوران پیغمبر مکی جگہ حضرت ابوبکر کا نماز پڑھانا، بذات خود ایک نامشخص اور مبہم داستان ہے اور یہ بات ثابت ہی نہیں کہ وہ نماز پڑھانے میں کامیاب بھی ہوئے کہ

۱- ﴿قَالُوا لَوْلَا نَزَّلَ هَذَا الْفُرْقَانُ اِنْ عَلٰى زُلْمَلٍ مِنَ الْقُرْآنِ عَظِيمٍ﴾ (زخرف/۳۱) دتیر جوع کریں اسراء/۹۰-۹۱

نہیں؟ اور یہ کام پیغمبرؐ کی اجازت سے انجام پایا تھا یا ایک من مانی حرکت تھی اور پیغمبرؐ کی بعض بیویوں کے اشارہ پر نماز میں پیغمبرؐ کی جانشینی پر قبضہ کرنے کی کوشش تھی؟! (اس بحث کی تفصیل آئندہ فصلوں میں ملاحظہ فرمائیں)

بہر حال اگر یہی امر امت اسلامیہ کی خلافت کی شائستگی کیلئے دلیل ہو، تو پیغمبرؐ بارہا مسافرت کے وقت اپنی جانشینی کی ذمہ داری من جملہ نماز کی امامت بعض افراد کو سونپتے رہے ہیں۔ ایسے افراد کا سراغ حیات پیغمبرؐ کی تاریخ میں ملتا ہے، یہ کیسے ممکن ہے کہ ان سب جانشینوں میں سے صرف ایک آدمی، وہ بھی صرف ایک نماز پڑھانے کی وجہ سے باقی لوگوں پر پیغمبرؐ کی جانشینی کا حقدار بن جائے؟

۳۔ شریعت کے اصول و فروع کا علم رکھنا، اسلامی معاشرے کی تمام ضرورتوں سے باخبر ہونا اور گناہ و خطا سے پاک ہونا، امامت و رسول خداؐ کی جانشینی کی دو بنیادی شرطیں ہیں، جبکہ سقیفہ کے جلسہ میں اگر کسی چیز پر گفتگو نہیں ہوئی تو وہ یہی دو موضوع تھے۔

کیا یہ مناسب نہیں تھا کہ یہ لوگ قومیت، رشتہ داری اور دیگر بہبودہ معیاروں پر انحصار کرنے کے بجائے علم و دانش اور عصمت اور پاک دامنی کے موضوع کو معیار قرار دے کر اصحاب پیغمبرؐ میں سے امت کی زعامت کیلئے ایک ایسے شخص کا انتخاب کرتے جو دین کے اصول و فروع سے بخوبی واقف ہو اور ابتدائے زندگی سے اس لمحہ تک اس سے کوئی غلطی سرزد نہ ہوئی ہو؟ اس طرح خود خواہی کے بجائے اسلام اور مسلمانوں کی مصلحت کو مد نظر رکھا جاتا؟

۴۔ ان دونوں گروہوں کے استدال کے طریقے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ لوگ پیغمبرؐ کی خلافت و جانشینی سے ظاہری حکومت اور لوگوں پر فرماں روائی کے علاوہ کوئی اور مقصد نہیں رکھتے تھے۔ انھوں نے پیغمبرؐ اسلام کے دیگر منصبوں سے چشم پوشی کر رکھی تھی اور ان کی طرف کوئی توجہ نہیں رکھتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ انصار، افراد کی کثرت اور اپنے قبیلہ کی طاقت پر ناز کرتے ہوئے اپنے کو دوسروں پر فضیلت دیتے اور حقدار سمجھتے تھے۔

یہ صحیح ہے کہ پیغمبر اسلامؐ مسلمانوں کے حاکم اور فرماں روا تھے، لیکن آپؐ اس مقام و منزلت کے علاوہ کچھ دوسرے فضائل اور منصبوں کے بھی مالک تھے کہ مہاجر و انصار کے امیدواروں میں ان کا شاید تک نہیں ملتا تھا۔ پیغمبر اسلامؐ شریعت کی تشریح کرنے والے، اصول و فروع کو بیان کرنے والے، اور گناہ و لغزش کے مقابلے میں معصوم تھے۔ ان افراد نے پیغمبرؐ کی جانشینی کا انتخاب کرتے وقت پیغمبر اسلامؐ کی ان معنوی فضیلتوں کو کیسے نظر انداز کر دیا جن کی وجہ سے آپؐ اسلامی معاشرہ میں برتر اور حکمران قرار پائے تھے بلکہ اسے ظاہری و سیاسی حکومت کے زاویہ سے دیکھا جو عموماً دولت، قدرت اور قبائلی قرابت کی بنیادوں پر قائم ہوتی ہے۔

اس غفلت یا تغافل کی وجہ واضح ہے، کیونکہ اگر اسلامی خلافت کو اس زاویہ سے دیکھتے تو انہیں اپنے آپ کو خلافت سے محروم کرنے کے سوا کوئی نتیجہ نہیں ملتا۔ اس لئے کہ دین کے اصول و فروع سے ان کی آگاہی بہت محدود تھی، حتیٰ حضرت ابو بکر کا مجوزہ امیدوار (حضرت عمر) سقیفہ کی میٹینگ سے تھوڑی ہی دیر پہلے پیغمبر اسلامؐ کی وفات کا منکر ہو چکا تھا اور اپنے ایک دوست کی زبانی قرآن مجید کی آیت لسنے کے بعد خاموش ہوا تھا۔ اس کے علاوہ حکمرانی کے دوران اور اس سے پہلے بھی ان لوگوں کی بے شمار غلطیاں اور خطائیں کسی سے پوشیدہ نہیں ہیں۔ ان حالات کے پیش نظر کیسے ممکن تھا کہ وہ ایک ایسی حکومت کی داغ بیل ڈال سکیں جس کی بنیاد علم و دانش، تقویٰ و پرہیزگاری، معنوی کمالات اور عصمت پر مستحکم ہو؟!

اصحاب سقیفہ کی منطق پر امیر المؤمنین کا تجزیہ

امیر المؤمنین علیہ السلام نے سقیفہ میں موجود مہاجرین و انصار کی منطق پر یوں تنقید فرمائی: جب ایک شخص نے امام کی خدمت میں آ کر سقیفہ کا ماجرا بیان کیا کہ: مہاجر و انصار کے دو گروہ اپنے آپ کو خلافت کا حقدار سمجھ رہے تھے تو علیؑ علیہ السلام نے فرمایا:

”تم نے انصار کو جواب کیوں نہ دیا کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ہم سے کہا ہے کہ ہم ان کے نیک افراد کے ساتھ نیکی کریں اور ان کے خطا کاروں کی تقصیر معاف کر دیں۔“

اس کے بعد امام علیہ السلام نے پوچھا: قریش کس اصول پر اپنے آپ کو خلافت کا حقدار سمجھتے تھے؟ اس شخص نے جواب دیا: وہ کہتے تھے ہمارا تعلق رسول خدا کے خاندان سے ہے اور ہمارا اور آپ کا قبیلہ ایک ہی ہے۔

حضرت علی علیہ السلام نے فرمایا: انہوں نے درخت سے اپنے لئے استدلال کیا اور اس کے پھل اور میوہ کو ضایع و برباد کر دیا۔ اگر وہ اسی لحاظ سے خلافت کے حقدار ہیں تو وہ ایک درخت کی ٹہنیاں ہیں اور میں اس درخت کا پھل اور آنحضرت کا چچیرا بھائی ہوں، پھر خلافت کا حقدار میں کیوں نہیں ہوں!

امیر المؤمنین کی خلافت کیلئے خود شائستہ ہونے کی منطق

سفینہ کا ماجرا انتہائی ناگفتہ بہ حالت میں اختتام کو پہنچا اور حضرت ابو بکر ایک فاتح کی حیثیت سے جلسہ سے باہر نکلے، کچھ لوگ انہیں اپنے گھیرے میں لئے ہوئے تھے اور لوگوں سے کہتے تھے: رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے خلیفہ کی بیعت کرو اور بیعت کو عمومی بنانے کیلئے لوگوں کے ہاتھ پکڑ پکڑ کر حضرت ابو بکر کے ہاتھ پر رکھتے تھے۔

ان ناگفتہ بہ حوادث کے تحت کہ یہاں پر ہم ان کی وضاحت کرنے سے قاصر ہیں، حضرت علیؑ کو مسجد میں لایا گیا تاکہ وہ بھی بیعت کریں۔

امام علیہ السلام نے خلافت کیلئے اپنی شائستگی اور سنت رسولؐ سے متعلق اپنے وسیع علم اور عدالت کی بنیادوں پر حکومت کرنے کی اپنی روحی توانائی و صلاحیت کے ذریعہ خلافت کیلئے اپنی لیاقت و شائستگی پر استدلال کرتے ہوئے فرمایا:

”اے گروہ مہاجر! جس حکومت کی پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بنیاد ڈالی ہے، اسے آنحضرت کے خاندان سے خارج کر کے اپنے گھروں میں نہ لے جاؤ۔ خدا کی قسم ہم اہل بیت پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس کے زیادہ حقدار ہیں۔ ہمارے درمیان ایسے افراد موجود ہیں جو قرآن مجید کے مفاتیح کا مکمل علم رکھتے ہیں۔ دین کے اصول اور فروع کو اچھی طرح جانتے ہیں۔ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سنت سے اچھی طرح آگاہ ہیں، اور اسلامی سماج کو بخوبی ادارہ کر سکتے ہیں۔ برائیوں کی روک تھام کر سکتے ہیں اور غنائم کو عادلانہ تقسیم کر سکتے ہیں۔“

جب تک معاشرے میں ایسے افراد موجود ہیں دوسروں کی باری نہیں آتی، ایسا شخص خاندان نبوت سے باہر کہیں نہیں مل سکتا۔ خبردار! ہوئی وہوس کے غلام نہ بنو کیونکہ اس طرح راہ خدا سے بھٹک جاؤ گے اور حق و حقیقت سے دور ہو جاؤ گے!

شیعہ روایات کے مطابق، امیر المؤمنینؑ بنی ہاشم کے ایک گروہ کے ہمراہ حضرت ابو بکر کے پاس گئے اور خلافت کے لئے مذکورہ صورت میں قرآن و سنت سے متعلق اپنے علم، اسلام میں سبقت اور جہاد میں ثابت قدمی، بیان میں فصاحت و بلاغت، شہامت اور شجاعت کو دلائل کے طور پر پیش کر کے اپنی شائستگی کو ثابت کیا اور فرمایا:

”میں پیغمبر اسلام کی حیات اور آپؐ کی وفات کے بعد منصب خلافت کا مستحق اور سزاوار ہوں، میں اسرار کا خزانہ اور علوم کا مخزن ہوں۔ میں صدیق اکبر اور فاروق اعظم ہوں۔“

۱۔ اللہ اللہ یا معشر المهاجرین لا تحربوا سلطان محمد فی العرب عن دارہ و قعر بیئہ الی دورکم و قعر بیوتکم و لا تدعوا اہلہ عن عمامہ فی الناس و حقہ، فو اللہ یا معشر المهاجرین لنحن احق الناس بہ، لانا اہل البیت و نحن احق بہذا الامر منکم ما کان فینا القاریع لکتاب اللہ، الفقیہ فی دین اللہ، العالم بسنن اللہ، المنضطلع بأمر الرعیۃ، المدافع عنهم الامور السیئۃ، القاسم بینہم بالسویۃ، و اللہ انہ لقینا، فلا تتعلو الیہوی لتضلوا عن سبیل اللہ فتزدادوا من الحق بعداً“ (الامانہ و السیاسة، ابن تیمیہ دینوری، ج ۱ ص ۱۱۲، احتجاج طبری، ج ۱ ص ۹۶)

میں پہلا شخص ہوں جو پیغمبر پر ایمان لایا اس راہ میں آپ کی تصدیق کی۔ میں مشرکین کے ساتھ جنگ و جہاد کے دوران سب سے زیادہ ثابت قدم، کتاب و سنت کے علم سے سب سے زیادہ آگاہ، دین کے اصول و فروع سے سب سے زیادہ واقف، بیان میں سب سے زیادہ فصیح اور ناخوشگوار حالات میں سب سے زیادہ قوی اور بہادر فرد ہوں، تم لوگ اس وراثت میں میرے ساتھ جنگ و جدال پر کیوں اتر آئے ہو۔

اسی طرح امیر المؤمنین اپنے ایک خطبہ میں خلافت کا حقدار ایسے شخص کو سمجھتے ہیں جو امت میں حکومت چلانے کیلئے سب سے بہادر حکم الہی کو سب سے زیادہ جاننے والا ہو:

”ایہا الناس ان احق الناس بهذا الامر اقواہم علیہ و اعلمہم بامر اللہ فیہ فان شعب شاعب استعجب فان ابي قوتل“^۱

یعنی اے لوگو! حکومت کیلئے سب سے شائستہ فرد وہ ہے جو سماج کا نظام چلانے میں سب سے زیادہ طاقت ور اور حکم الہی کو جاننے میں سب سے زیادہ عالم ہو۔ اگر کوئی شخص فساد کو ہوادے اور وہ حق کے سامنے تسلیم نہ ہو تو اس کی تشبیہ کی جائے گی اور اگر اپنی غلطی کو جاری رکھے تو قتل کیا جائے گا۔

یہ صرف حضرت علی علیہ السلام کی منطق نہیں ہے بلکہ آپ کے بعض مخالفین بھی جب بیدار ضمیر کے ساتھ بات کرتے ہیں تو خلافت کیلئے حضرت علی کی شائستگی کا اعتراف کرتے ہیں کہ آپ

۱۔ انا اولی برسول اللہ حیاً و متاً و انا وصیہ و وزیرہ و مستودع سرّہ و علمہ ، و انا الصّدیق الاکبر و الفاروق الاعظم، اول من آمن بہ و صدقہ ، و احسنکم بلائاً فی جہاد المشرکین، و اعرفکم بالکتاب و السنۃ ، افہیکم فی الدین و اعلمکم بعواقب الامور و اذرکم لساناً و البکم جناناً لعلکم تنزعوا فی هذا

الامر (احتجاج طبرسی، ج ۱۲، ص ۹۵)

۲۔ نوح البلاغ، عہدہ، خطبہ ۱۶۸۔

کا حق چھین لیا گیا۔

جب ابو عبیدہ جراح حضرت ابوبکر کی بیعت سے حضرت علی علیہ السلام کے انکار کے بارے میں آگاہ ہوئے تو امام علیہ السلام کی طرف رخ کر کے بولے:

”حکمرانی کو ابوبکر کیلئے چھوڑ دیجئے، اگر آپ زندہ رہے اور طولانی عمر آپ کو نصیب ہوئی تو آپ حکمرانی کیلئے سب سے شائستہ ہیں کیونکہ آپ کی فضیلت، قوی ایمان، وسیع علم، حقیقت پسندی، اسلام قبول کرنے میں پیش قدمی اور پیغمبر اسلام کے ساتھ آپ کی قربت کسی سے پوشیدہ نہیں ہے!“

تیرہویں فصل

نماز کی امامت، خلافت کیلئے دلیل نہیں!

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد امت کی قیادت کا موضوع گزشتہ چودہ صدیوں سے عقائد اور مذاہب کے علماء اور دانشوروں کے درمیان مسلسل مورد بحث قرار پاتا رہا ہے، لیکن آج تک ایک محقق بھی ایسا پیدا نہیں ہوا جو یہ تو جیہ کرے کہ حضرت ابو بکر کی خلافت پیغمبر اسلام کی نص کے مطابق عمل میں آئی ہے اور یہ کہے کہ پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت ابو بکر کی خلافت کے بارے میں اپنی حیات میں لوگوں کو وصیت کی تھی۔

حضرت ابو بکر کی خلافت کے بارے میں سنی علماء کے تمام دلائل مہاجرین و انصار کی بیعت اور خلافت پر اتفاق نظر تک محدود ہیں اور یہ امر کہ حضرت ابو بکر کی خلافت پیغمبر اکرم کی نص کے مطابق نہیں تھی، یہ بات خود سقیفہ میں حضرت ابو بکر اور ان کے ہمفکروں کے بیانات سے بالکل ظاہر اور واضح ہو جاتی ہے۔ اگر حضرت ابو بکر کی خلافت کے بارے میں پیغمبر کی طرف سے کوئی نص موجود ہوتی تو وہ خود سقیفہ میں حضرت عمر اور ابو عبیدہ کا ہاتھ پکڑ کر ہرگز یہ نہ کہتے کہ: ”قد رضیت لکم ہذین الرجلین“ میں ان دو افراد کو خلافت کیلئے صالح اور شائستہ جانتا ہوں اور ان دونوں کے انتخاب پر راضی ہوں۔

اس کے علاوہ اگر حضرت ابو بکر کی خلافت کے سلسلے میں کوئی الہی نص موجود ہوتی، تو سقیفہ میں

قریش کی پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے قرابت اور ان کی اسلام میں سبقت کے ذریعہ استدلال نہیں کیا جاتا اور ان کے دوست وہم فکر کبھی حضرت ابوبکر کے پیغمبر کے ساتھ غارتوں میں ہم سفر ہونے اور نماز میں پیغمبر کی جانشینی جیسے مسائل سے اپنے استدلال کو تقویت نہ بخشتے۔

خود حضرت ابوبکر نے سقیفہ کے دن انصار کے امیدوار کی تنقید کرتے ہوئے کہا:

”ان العرب لا تعرف هذا الامر الا للقریش اوسط العرب داراً و نسباً“،

عرب معاشرہ قریش کے علاوہ — جو حسب و نسب کے لحاظ سے دوسروں پر برتری رکھتے

ہیں — کسی کو خلافت کیلئے شائستہ نہیں جانتا۔

اگر حضرت ابوبکر کی خلافت کے حق میں رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ایک لفظ بھی بیان ہوا ہوتا تو ان کمزور دلائل سے استدلال کرنے کے بجائے اس کا سہارا لیکر خود حضرت ابوبکر کہتے: اے لوگو! پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فلاں سال اور فلاں روز مجھے مسلمانوں کے پیشوا اور خلیفہ کے طور پر منتخب کیا ہے۔

یہ کیسے کہا جاسکتا کہ حضرت ابوبکر کی خلافت کو پیغمبر نے مہین فرمایا ہے جب کہ وہ خود بیماری کی حالت میں تمنا کرتے تھے، کہ کاش میں نے پیغمبر اسلام سے یہ پوچھ لیا ہوتا کہ ”امت کی قیادت“ کا حقدار کون ہے؟

عالم اسلام کے مشہور مؤرخ، طبری اس واقعہ کو تفصیل سے بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

”جب ابوبکر بیمار ہوئے اور قریش کا ایک معروف سرمایہ دار عبدالرحمان بن عوف ان کی عیادت کیلئے آیا تو مقداتی گفتگو کے بعد ابوبکر نے انتہائی افسوس کے ساتھ لوگوں کی طرف رخ کر کے کہا:

میری تکلیف کی پہلی وجہ وہ تین چیزیں ہیں جن کو میں نے انجام دیا ہے، کاش میں نے انہیں انجام نہ دیا ہوتا! اور تین چیزیں اور ہیں کہ کاش میں نے ان کے بارے میں پیغمبر

اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے سوال کیا ہوتا۔

وہ تین چیزیں جنہیں کاش میں نے انجام نہ دیا ہوتا حسب ذیل ہیں:

۱۔ کاش فاطمہؑ کا گھر نہ کھلوا یا ہوتا چاہے جنگ و جدال کی نوبت آ جاتی۔

۲۔ کاش میں نے سقیفہ کے دن خلافت کی ذمہ داری اپنے کندھوں پر نہ لی ہوتی اور اسے عمر یا ابو عبیدہ کے سپرد کر کے خود وزیر و مشیر کے عہدہ پر رہتا۔

۳۔ کاش ایاس بن عبد اللہ کو جو راہزنی کرتا تھا، آگ میں جلانے کے بجائے تلوار سے قتل کرتا۔

اور وہ تین چیزیں جن کے بارے میں کاش میں نے پیغمبر اکرمؐ سے پوچھ لیا ہوتا یہ ہیں:

۱۔ کاش میں نے پوچھ لیا ہوتا کہ خلافت و قیادت کا حقدار کون ہے؟ اور خلافت کا لباس کس کے بدن کے مطابق ہے؟

۲۔ کاش میں سوال کر لیا ہوتا کہ کیا اس سلسلے میں انصار کا کوئی حق بنتا ہے؟

۳۔ کاش میں نے پھوپھی اور بہن کی بیٹی کی میراث کے بارے میں پیغمبر اسلامؐ سے دریافت کر لیا ہوتا!۔

نماز میں حضرت ابو بکر کی جانشینی

اہل سنت کے بعض علماء اور دانشوروں نے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بیماری کے دوران نماز میں حضرت ابو بکر کی جانشینی کے موضوع کو بڑی شد و مد سے نقل کیا ہے اور اسے ایک بڑی فضیلت یا خلافت کے لئے سند شمار کر کے یہ کہنا چاہا کہ جب پیغمبرؐ نماز میں ان کی جانشینی

پر راضی ہوں تو لوگوں کو ان کی خلافت اور حکمرانی پر اور بھی زیادہ راضی ہونا چاہئے جو ایک دنیوی امر ہے۔

جواب:

یہ استدلال کئی جہتوں سے قابل رد ہے:

۱۔ تاریخی لحاظ سے کسی بھی صورت میں ثابت نہیں ہے کہ نماز میں حضرت ابو بکر کی جانشینی پیغمبر کی اجازت سے انجام پائی ہو۔ بعید نہیں ہے کہ انہوں نے خود یا کسی کے اشارہ پر یہ کام انجام دیا ہو۔ اس امر کی تائید اس واقعہ سے ہوتی ہے کہ حضرت ابو بکر نے ایک بار اور پیغمبر کی اجازت کے بغیر آپ کی جگہ کھڑے ہو کر نماز کی امامت خود شروع کر دی تھی۔

اہل سنت کے مشہور محدث امام بخاری اپنی صحیح میں نقل کرتے ہیں: ایک دن پیغمبر قبیلہ بنی عمرو بن عوف کی طرف گئے تھے۔ نماز کا وقت ہو گیا ابو بکر پیغمبر کی جگہ پر کھڑے ہو گئے اور نماز کی امامت شروع کر دی جب پیغمبر مسجد میں پہنچے اور دیکھا کہ نماز شروع ہو چکی ہے تو نماز کی صفوں کو چیرتے ہوئے محراب تک پہنچ گئے اور نماز کی امامت خود سنبھال لی اور ابو بکر پیچھے ہٹ کر بعد والی صف میں کھڑے ہوئے۔^۱

۲۔ اگر ہم فرض کر لیں کہ حضرت ابو بکر نے پیغمبر کے حکم سے آپ کی جگہ پر نماز پڑھائی ہوگی تو نماز میں امامت کرنا ہرگز حکومت اور خلافت جیسی انتہائی اہم ذمہ داری کی صلاحیت کیلئے دلیل نہیں بن سکتا۔

نماز کی امامت کیلئے قرأت کے صحیح ہونے اور احکام نماز جاننے کے علاوہ کوئی اور چیز معتبر نہیں ہے (اور اہل سنت علماء کی نظر میں عدالت تک کی شرط نہیں ہے) لیکن خلافت اسلامیہ کے حاکم کیلئے سنگین شرائط ہیں جن میں سے کسی ایک شرط کو نماز کی امامت کیلئے ضروری نہیں سمجھا جاتا ہے، جیسے:

اصول اور فروع دین پر مکمل دسترس اور کامل آگاہی رکھنا۔
 احکام اور حدودِ الہی کے تحت مسلمانوں کے امور کو چلانے کی پوری صلاحیت رکھنا۔
 گناہ اور خطا سے مبرا ہونا.....

اس استدلال سے پتا چلتا ہے کہ استدلال کرنے والے نے امامت کے منصب کو ایک معمولی منصب تصور کر لیا ہے اور اس سے پیغمبرؐ کی جانشینی کو ایک عام حکمرانی کے سوا کچھ اور نہیں سمجھا ہے اسی لئے وہ کہتا ہے کہ: جب پیغمبرؐ نے ابو بکر کو دینی امر کیلئے منتخب کر لیا تو لازم اور ضروری ہے کہ ہم ان کی خلافت پر اور بھی زیادہ راضی ہوں، جو ایک دنیوی امر ہے۔

اس جملہ سے معلوم ہوتا ہے کہ کہنے والے نے اسلامی حکمرانی سے وہی معنی مراد لیا ہے جو دنیا کے عام حکمرانوں کے بارے میں تصور کیا جاتا ہے۔ جبکہ پیغمبرؐ کا خلیفہ ظاہری حکومت اور مملکت کے امور کو چلانے کے علاوہ کچھ ایسے معنوی منصبوں اور اختیارات کا بھی مالک ہوتا ہے جو عام حکمران میں نہیں پائے جاتے اور ہم اس سلسلے میں اس سے پہلے مختصر طور پر بحث کر چکے ہیں۔

۳۔ اگر نماز کیلئے حضرت ابو بکر کی امامت پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حکم سے انجام پائی تھی، تو پیغمبر اکرمؐ بخار اور ضعف کی حالت میں ایک ہاتھ کو حضرت علیؑ کے شانے پر اور دوسرے ہاتھ کو ”فضل بن عباس“ کے شانے پر رکھ کر مسجد میں کیوں داخل ہوئے اور حضرت ابو بکر کے آگے کھڑے ہو کر نماز کیوں پڑھائی؟ پیغمبر کا یہ عمل امامت کیلئے حضرت ابو بکر کے تعین سے میل نہیں کھاتا۔ اگرچہ اہل سنت علماء نماز میں پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شرکت کی اس طرح توجیہ کرتے ہیں کہ حضرت ابو بکر نے پیغمبر اکرمؐ کی اقتداء کی اور لوگوں نے ابو بکر کی اقتداء کی۔ اسی صورت میں نماز پڑھی گئی!

واضح ہے کہ یہ توجیہ بہت بعید اور ناقابل قبول ہے، کیونکہ اگر یہی مقصود تھا تو کیا ضرورت تھی

کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس ضعف و بھاری کی حالت میں اپنے پیچھے بھائیوں کا سہارا لیکر مسجد میں تشریف لاتے اور نماز کیلئے کھڑے ہوتے؟ بلکہ اس واقعہ کا صحیح تجزیہ یہ ہے کہ پیغمبر اکرمؐ اپنی اس کاروائی سے حضرت ابو بکر کی امامت کو توڑ کر خود امامت کرنا چاہتے تھے۔

۳۔ بعض روایتوں سے پتا چلتا ہے کہ نماز کیلئے حضرت ابو بکر کی امامت ایک سے زیادہ بار واقع ہوئی ہے اور ان سب کا پیغمبر کی اجازت سے ثابت کرنا بہت مشکل اور دشوار ہے کیونکہ پیغمبر اکرمؐ نے اپنے بیماری کے آغاز میں ہی اسامہ بن زید کے ہاتھ میں پرچم دیکر سب کو رومیوں سے جنگ پر جانے اور مدینہ ترک کرنے کا حکم دے دیا تھا۔ اور لوگوں کے جانے پر اس قدر مصرحتے کہ مکرر فرماتے تھے:

”جهنم وجيش اسامة“ اسامہ کے لشکر کو تیار کرو۔

اور جو افراد اسامہ کے لشکر میں شامل ہونے سے انکار کر رہے تھے، آپ ان پر لعنت بھیج کر خدا کی رحمت سے محروم ہونے کی دعا فرماتے تھے!

ان حالات میں پیغمبر اکرمؐ کو امامت کے فرائض انجام دینے کی اجازت کیسے دیتے؟!

۵۔ مؤرخین اور محدثین نے اقرار کیا ہے کہ جس وقت حضرت ابو بکر نماز کی امامت کرنا چاہتے

تھے، پیغمبر اکرمؐ نے حضرت عائشہ، ابو بکر کی بیٹی سے فرمایا:

”فانكن صواحب يوسف“

”تم مصر کی عورتوں کے مانند ہو جنہوں نے یوسفؑ کو اپنے گھیرے میں لے لیا تھا“

اب دیکھنا چاہئے کہ اس جملہ کا مفہوم کیا ہے، اور اس سے پیغمبرؐ کا مقصد کیا تھا؟

یہ جملہ اس امر کی حکایت کرتا ہے کہ حضرت عائشہ پیغمبر اکرمؐ کی تشبیہ کے باوجود اسی طرح خیانت کی مرتکب ہوئی تھیں، جس طرح مصر کی عورتیں خیانت کی مرتکب ہوئیں تھیں اور زینحہ

کو عزیز مصر سے خیانت کرنے پر آمادہ کرتی تھیں۔

جس خیانت کے بارے میں یہاں پر تصور کیا جاسکتا ہے، وہ اس کے سوا کچھ نہیں کہ حضرت عائشہ نے پیغمبر اکرمؐ کی اجازت کے بغیر اپنے باپ کو پیغام بھیجا تھا کہ پیغمبرؐ کی جگہ پر نماز پڑھائیں۔

اہل سنت کے علماء، پیغمبر اسلامؐ کے اس جملہ کی دوسرے انداز میں تفسیر کرتے ہیں اور کہتے ہیں:

پیغمبرؐ اصرار فرماتے تھے کہ حضرت ابو بکرؓ آپؐ کی جگہ پر نماز پڑھائیں، لیکن حضرت عائشہ راضی نہیں تھیں، کیونکہ وہ کہتی تھیں کہ لوگ اس عمل کو فال بد تصور کریں گے اور حضرت ابو بکرؓ کی نماز میں امامت کو پیغمبرؐ کی موت سے تعبیر کریں گے اور حضرت ابو بکرؓ کو پیغمبرؐ کی موت کا پیغام لانے والا تصور کریں گے۔

کیا یہ توجیہ پیغمبر اسلامؐ کے عمل (مسجد میں حاضر ہو کر امامت کو سنبھالنے) سے میل کھاتی ہے!!؟

یہاں پر میں اپنی بات تمام کرتے ہوئے اس قضیہ کی صحیح نتیجہ گیری کا فیصلہ قارئین کرام پر چھوڑتا ہوں۔

حکومت، روحانی قیادت سے جدا نہیں

اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم لوگوں کے حاکم و فرماں روا ہونے کے ساتھ معنوی اور روحانی پیشوا بھی تھے۔ قرآنی آیات، اسلامی متون اور معتبر تاریخ اس امر کے شاہد ہیں کہ پیغمبر اسلام نے مدینہ منورہ میں اپنے قیام کے ابتدائی لمحات سے اسلامی حکومت کی داغ بیل ڈالی اور حقیقی حکمرانی کی تمام ذمہ داریاں اپنے کندھوں پر اٹھائیں اور اسلامی معاشرے کے بعض سیاسی، سماجی اور اقتصادی امور کو اپنی سرپرستی میں بعض شائستہ اور لائق افراد کو سونپا۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے خدا کی طرف سے فرماں روا اور حاکم ہونے کی بہت سی مثالیں ہیں یہاں ہم قارئین کرام کی توجہ کے لئے ذیل میں صرف چند مثالیں پیش کرتے ہیں:

۱۔ قرآن مجید پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو مسلمانوں کی جانوں سے اولیٰ قرار دیتے ہوئے فرماتا ہے:

﴿النَّبِيُّ أَوْلَىٰ بِالْمُؤْمِنِينَ مِنْ أَنفُسِهِمْ﴾

پیشک نبی تمام مؤمنین پر ان کی جانوں سے زیادہ اولیٰ ہے۔

۲۔ قرآن مجید پیغمبر اکرم کو حاکم و قاضی قرار دیتا ہے کہ مسلمانوں کے درمیان الہی قوانین کے

تحت فیصلے کرے، چنانچہ اس سلسلے میں فرماتا ہے:

﴿فَأَحْكُم بَيْنَهُم بِمَا أَنْزَلَ اللَّهُ وَلَا تَتَّبِعْ أَهْوَاءَهُمْ﴾^۱

”آپ ان کے درمیان تنزیل خدا کے مطابق فیصلہ کریں اور خدا کی طرف سے آئے

ہوئے حق سے الگ ہو کر ان کے خواہشات کا اتباع نہ کریں“

۳۔ پیغمبر اکرمؐ لوگوں میں نہ صرف خود فرماں روائی اور حکمیت کے فرائض انجام دیتے تھے بلکہ ہر علاقے کو فتح کرنے کے بعد، وہاں پر خود ایک شاہتہ شخص کو بعنوان حاکم، دوسرے کو قاضی کی حیثیت سے اور تیسرے کو قرآن و احکام الہی کی تعلیم دینے کیلئے دینی معلم کی حیثیت سے مقرر فرماتے تھے اور بعض اوقات یہ تینوں عہدے ایک ہی فرد کو سونپتے تھے۔

پیغمبر اکرمؐ کے زمانے میں ہی امیر المؤمنین علی علیہ السلام عبد اللہ ابن مسعود، ابی ابن کعب اور زید بن ثابت وغیرہ قضاوت اور حکمیت کے فرائض انجام دیا کرتے تھے۔^۲

جب پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مکہ اور یمن کو فتح کیا تو ”عتاب بن اسید“ کو مکہ کا گورنر اور ”بازان“ کو یمن کا حاکم منتخب فرمایا:

کتاب ”التراہیب الاداریہ“ کے مؤلف ”عبدالرحمن کتانی“ نے اپنی کتاب میں ان مسلمان گورنروں کی فہرست ذکر کی ہے، جنہیں پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے زمانے میں مختلف علاقوں کے سماجی، سیاسی اور اقتصادی امور کی ذمہ داری سنبھالنے کیلئے منتخب فرمایا تھا۔ اس کتاب کے مطالعہ سے پیغمبر اسلامؐ کے ذریعہ تشکیل دی گئی اسلامی حکومت کے طریقہ کار کا اشارہ ملتا ہے۔^۳

اسلام نے جہاد کی دعوت دے کر اور دین الہی کو پھیلانے کیلئے جہاد کے خصوصی قوانین بیان کئے اور مسلمانوں میں جنگی اور دفاعی تربیت کو وسیع پیمانے پر رائج کیا۔ ساتھ ہی پیغمبر اسلام صلی

۱۔ ماخذ/۸

۲۔۳۔ التراہیب الاداریہ، ج ۱، ص ۲۸۵۔

اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ۲۷ جنگوں میں بذات خود حصہ لیا اور ۵۵ "سریہ" میں لشکر کے سردار معین کئے۔ اس طرح سے اسلامی حکومت کا چہرہ لوگوں کے سامنے نمایاں فرمایا اور یہ ثابت کر دیا کہ آپؐ کی دعوت حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی دعوت کے مانند فقط روحانی، معنوی دعوت نہیں ہے آپ کی رہبری احکام بیان کرنے اور تبلیغ دین کے لئے صرف وعظ و نصیحت تک محدود نہیں ہے بلکہ آپ کی دعوت و معنوی رہنمائی ایک طاقتور حکومت کی تشکیل کے ہمراہ تھی تاکہ اپنے پیروؤں کو دشمنوں کے گزند سے محفوظ رکھ سکیں، کتاب خدا اور دین اسلام کو ان سے بچا سکیں اور یہ حکومت انسانی سماج میں الہی قوانین کے نفاذ کی ضامن بن سکے۔

اسلام کا اقتصادی نظام، حکومتی آمدنی، جیسے انفال وغیرہ اور عوامی آمدنی جیسے زکات و خمس وغیرہ اس امر کی واضح دلیل ہے کہ اسلام ایک جامع و کامل نظام ہے جس نے انسانوں کی سماجی زندگی کے تمام پہلوؤں میں ایک مکمل اور ہمہ گیر نظریہ پیش کیا ہے اور صرف محدود پیمانے پر خشک مذہبی مراسم، وہ بھی ہفتہ میں ایک روز کی عبادت پر اکتفا نہیں کیا ہے۔

لیکن اس جملے کا ہرگز یہ مطلب نہیں ہے کہ حقیقی عیسائی دین کی بنیاد یہی تھی، بلکہ مسیحیت کے خود غرض مدعیوں نے قیصر و پاپ کے روپ میں دین مسیحیت کو رفتہ رفتہ اس صورت میں تبدیل کیا ہے اور حضرت عیسیٰؑ کے دین کو سماجی میدان سے خارج کر کے رکھ دیا ہے جب کہ بہت سے پیغمبر اس مقام و منصب کے مالک تھے۔

قرآن مجید بالکل واضح طور پر حضرت لوط اور حضرت یوسف علیہما السلام کے بارے میں کہتا ہے:

"کہ ہم نے انھیں حکومت اور فرمان روائی دی" ^۱

خود حضرت یوسف بارگاہ الہی میں حمد و ثنا کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

۱- سریاں جنگ کو کہتے ہیں جس میں آنحضرتؐ شامل تھے۔

﴿رَبِّ قَدْ آتَيْتَنِي مِنَ الْمَلِكِ﴾

پروردگارا! تو نے مجھے ملک عطا کیا!

قرآن مجید نے حضرت داؤد کی قضاوت اور ان کی حکومت، اور حضرت سلیمان و طالوت کی فرمان روائی اور حکومت کیلئے ان کی امتیازی حیثیتوں کا ذکر کیا ہے۔ اس طرح پیغمبروں کو الہی حکومت کے بانی اور حکم الہی نافذ کرنے والوں کی حیثیت سے پہچوایا ہے۔

امر بالمعروف ونہی عن المنکر کے وسیع ابواب جو حکومت اسلامی کے نفاذ کی عملی بنیادوں میں سے ایک ہیں اور اسی طرح معاملات، حدود، دیات اور فقہ کے دیگر ابواب کے تمام قوانین کے مطالعہ سے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف سے قائم کی گئی حکومت کا طریقہ کار ہر شخص کیلئے واضح و روشن ہوتا ہے۔

یہ مسئلہ اس قدر واضح ہے اور خود پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زندگی اور خلفاء کی حکومت، خصوصاً امیر المؤمنین علی علیہ السلام کی الہی حکومت کے دور اس امر کے اتنے نمایاں گواہ ہیں کہ ہم اس سلسلے میں مزید وضاحت سے اپنے آپ کو بے نیاز سمجھتے ہیں۔

بیان احکام اور لوگوں کی رہنمائی

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم حکومت اور سیاسی فرمان روائی کے علاوہ احکام الہی کو بیان کرنے والے الہی قوانین کے مفسر اور قرآن مجید کی آیات کے اغراض و مقاصد بیان کرنے کے عہدہ دار بھی تھے۔

قرآن مجید آپ کو مندرجہ ذیل آیہ شریفہ میں کتاب خدا کے عالی مقام پر بیان کرنے والے کی حیثیت سے پہچوایا ہے:

﴿وَأَنْزَلْنَا إِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ إِلَيْهِمْ﴾

اور آپ کی طرف ذکر (قرآن) کو نازل کیا ہے تاکہ لوگوں کیلئے ان احکام کو واضح کر دیں جو ان کی طرف نازل کئے گئے ہیں۔

آیہ شریفہ میں کلمہ ”لِتُبَيِّنَ“ تاکہ آپ بیان کریں) سے واضح ہوتا ہے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم قرآن مجید کی آیات کی تلاوت کے علاوہ اس امر پر بھی مامور تھے کہ ان آیات کے مفہم اور مضامین کی وضاحت فرمائیں۔ اگر آپ کا فریضہ صرف آیات الہی کو پڑھنا ہوتا تو کلمہ ”لِتُبَيِّنَ“ کے بجائے ”لِتُفْرَأَ“ یا ”لِتُسْمَعُ“ ہوتا۔

بیشک قرآن مجید کے حکم کے مطابق آنحضرت کتاب خدا اور اس کے حکیمانہ احکام کے معلم ہیں، جیسا کہ فرماتا ہے:

﴿هُوَ الَّذِي بَعَثَ فِي الْأُمِّيِّينَ رَسُولًا مِنْهُمْ يَتْلُوا عَلَيْهِمْ آيَاتِهِ وَيُزَكِّيهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ﴾

”اس خدا نے مکہ والوں میں ایک رسول بھیجا جو انہیں میں سے تھا کہ ان کے سامنے آیات کی تلاوت کرے، ان کے نفوس کو پاکیزہ بنائے اور انہیں کتاب و حکمت کی تعلیم دے“

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنی زندگی کے دوران ان دو عہدوں (حاکمیت اور الہی احکام کے نفاذ) نیز احکام کی رہنمائی و تبلیغ پر فائز تھے اور یقیناً آپ کی رحلت کے بعد بھی، اسلامی معاشرے کو ایک ایسے شخص کی ضرورت تھی جو ان دو منصبوں کا حامل ہو۔ اب ہمیں دیکھنا چاہئے کہ ان خصوصی شرائط کا حامل کون شخص ہے جو ان دو امور میں معاشرے

کی باگ ڈور سنبھال سکے؟

واضح ہے کہ احکام بیان کرنا اور لوگوں کو حلال و حرام بتانا، اخلاقی فضائل اور ان کی فطری خوبیوں کی راہنمائی کرنا یعنی ایک جملہ میں یوں کہا جائے کہ: دینی رہبری اور معنوی امور کی قیادت کیلئے عصمت اور خطا و گناہ سے پاک ہونے اور وسیع علم کا مالک ہونے کی ضرورت ہے کیونکہ لوگوں پر مکمل قیادت، جس میں پیشوا کا قول و فعل لوگوں کے لئے ہادی و رہنما ہو، اس کی مکمل پرہیزگاری (جسے عصمت کہتے ہیں) اور وسیع علم پر منحصر ہے۔

دوسرے الفاظ میں: اسلامی معاشرے کے قائد کو احکام اور اصول و فروع دین پر مکمل دسترس ہونی چاہئے، اس کے بغیر وہ لوگوں کیلئے مکمل راہنما اور الٰہی رہبر نہیں بن سکتا، اگلے صفحات میں ہم ثابت کریں گے کہ ہمہ گیر رہبری و رہنمائی عصمت کے بغیر ممکن نہیں ہے۔

قرآن مجید خدائے تعالیٰ کی طرف سے طاہر و پاک فرمان روائی کے عہدے کیلئے منتخب کرنے کا سبب دو چیزیں بیان فرماتا ہے:

۱۔ علم و دانش میں برتری

۲۔ جسمانی لحاظ سے طاقتور ہونا، جس کی وجہ سے دن رات، وقت بے وقت قوم کیلئے کام کر سکے اور قیادت کی ذمہ داری سنبھال سکے (حکام کے لئے دوسری شرط زمانہ قدیم سے تجربہ کے ذریعہ ثابت ہو چکی ہے، حتیٰ یہ بات ضرب المثل بن گئی ہے کہ: صحیح عقل و فکر صحت مند بدن میں ہوتی ہے) اب یہ آئیے شریفہ ملاحظہ ہو:

﴿إِنَّ اللَّهَ اصْطَفَىٰ عَلَيْكُمْ وَزَادَهُ بَسْطَةً فِي الْعِلْمِ وَالْجِسْمِ﴾

”انہیں (طاہر و پاک) اللہ نے تمہارے لئے منتخب کیا ہے اور ان کے علم و جسم میں وسعت

فرمائی ہے“

امیر المؤمنین علیہ السلام جب اپنے سپاہیوں اور افسروں کو خطاب فرماتے تھے اور انہیں خدا کی راہ میں جہاد کرنے کی ترغیب و دعوت دیتے تھے تو اسلامی معاشرے کو ہر جہت سے ادارہ کرنے کی اپنی صلاحیت اور شائستگی بیان کرنے کیلئے اسی آیہ شریفہ سے استدلال کرتے تھے اور فرماتے تھے:

لوگو! اس قرآن مجید کی پیروی کرو اور اس سے نصیحت حاصل کرو جسے خدائے تعالیٰ نے اپنے پیغمبرؐ پر نازل کیا ہے ہم قرآن مجید میں پڑھتے ہیں کہ بنی اسرائیل کے ایک گروہ نے حضرت موسیٰؑ کی وفات کے بعد اپنے پیغمبر سے درخواست کی کہ خداوند عالم ان کیلئے ایک حاکم و فرماں روا منتخب کرے جس کی رہبری میں وہ خدا کی راہ میں جہاد کریں۔ خدائے تعالیٰ نے حضرت طالوت کو ان کی فرماں روائی کیلئے منتخب فرمایا، لیکن بنی اسرائیل نے ان کی اطاعت نہیں کی، اور اس کام کیلئے ان کی صلاحیت اور شائستگی میں شک کرنے لگے۔ خدائے تعالیٰ نے اپنے پیغمبر کو حکم دیا کہ ان لوگوں سے کہدو کہ اس منصب کیلئے طالوت کے انتخاب کا سبب علمی لحاظ سے ان کی برتری اور جسمی توانائی ہے۔

لوگو! ان قرآنی آیات میں تم لوگوں کیلئے پند و عبرت پوشیدہ ہے۔ خدائے تعالیٰ نے اس لئے طالوت کو ان کیلئے حاکم اور فرمانروا قرار دیا تھا کہ وہ علم و جسمی توانائی میں ان سے برتر تھے اور وہ ان خصوصیات کی بنا پر جہاد و جدوجہد کر سکتے تھے!

حضرت امام حسن مجتبیٰؑ بھی اہل بیت رسولؐ کی خلافت و امامت کیلئے شائستگی ثابت کرنے کے لئے تمام الہی احکام اور امت کی تمام ضرورتوں کے بارے میں ان کے علم پر تکیہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

لوگو! امت کے پیشوا ہمارے خاندان سے ہیں اور پیغمبرؐ کی جائز نشینی کی صلاحیت ہمارے

علاوہ کوئی نہیں رکھتا، خدائے تعالیٰ نے قرآن مجید میں اپنے پیغمبرؐ کے ذریعہ ہمیں اس منصب کیلئے مشائستہ قرار دیا ہے، کیونکہ علم و دانش ہمارے پاس ہے، اور ہم قیامت تک رونما ہونے والے ہر حکم، حتیٰ بدن پر لگی ایک معمولی خراش کے حکم سے بھی آگاہ ہیں۔

دو منصب کو ایک دوسرے سے جدا کرنا صحیح نہیں

حاکمیت کو معنوی قیادت کے منصب سے جدا کرنا ایسی چیز نہیں ہے جو اہل سنت علماء کی تازہ فکری پیداوار ہو بلکہ یہ بہت پرانی تاریخ ہے۔

اس کی وضاحت یہ ہے کہ سفید کا ماجرا ختم ہوا اور حضرت ابو بکر نے امور اپنے ہاتھ میں لئے اور ظاہراً حکومت کی باگ ڈور سنبھالی، رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے صحابیوں میں ایک گروہ ایسا تھا، جو امیر المؤمنین کو خلافت کے عہدے سے محروم کرنے پر سخت ناراض تھا، کیونکہ جنگ تبوکؓ کیلئے مدینہ سے باہر نکلنے وقت، غدیرؓ کے دن اور اپنی بیماریؓ کے ایام میں پیغمبر اسلامؐ کے ارشادات بھی ان کے کانوں میں گونج رہے تھے۔

۱۔ "ان الأئمة فينا و ان الخلافة لا تصلح إلا فينا و ان الله جعلنا اهلہ فی کتابہ و سئد لیبہ و ان العلم فينا و

نحن اهلہ و انه لا يحدث شیء الی یوم القیامة حتی ارش الخلدش آلا و هو عندنا" (احتجاج طبرسی، ج ۳ ص ۶)

۲۔ جب پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے تبوک کی جنگ پر جانے کا فیصلہ کیا تو، حضرت علیؓ کو اپنا جانشین مقرر کر کے فرمایا، انت

منی بمنزلہ ہارون من موسیٰ آلا انه لا ینب بعدی" تم میرے لئے ویسے ہی ہو جیسے ہارون موسیٰ کیلئے تھے، فرق صرف یہ

ہے کہ میرے بعد کوئی نبی نہیں آئے گا، پیغمبر اسلام نے اس جملہ سے نبوت کے علاوہ تمام منصبوں کو علیؓ کیلئے ثابت کر دیا

۳۔ حدیث غدیر کی تفصیل انیسویں فصل میں آئے گی۔

۴۔ یہاں مقصود حدیث ثقلین ہے کہ اس کے بارے میں بائیسویں فصل میں گفتگو آئے گی۔

اس لئے کچھ حق پسند افراد اس ڈرامائی انداز میں خلافت کے غصب کرنے پر سخت غصے میں آئے، یہ لوگ کسی فریق کی طرفداری کئے بغیر خلیفہ کے پاس جا کر علیؑ کے بارے میں سوال کرتے تھے، خلیفہ اور اس کے ساتھیوں کے پاس اس کے سوا کوئی جواب نہیں تھا کہ دو منصبوں کو ایک دوسرے سے جدا کرنا ضروری ہے وہ کہتے تھے کہ ”منصب حکومت اور معنوی قیادت ہرگز ایک ساتھ ایک خاندان میں جمع نہیں ہو سکتے“

رسول خدا کا ایک صحابی بریدہ بن نصیب، پیغمبر کی رحلت کے وقت مدینہ سے باہر ماموریت پر گیا تھا۔ وہ پیغمبر کی رحلت کے بعد واپس مدینہ آیا اور اس نے حالات کو دگرگوں پایا، تو ایک پرچم حضرت علیؑ کے دروازے پر نصب کر کے غصہ کی حالت میں مسجد میں داخل ہوا اور خلیفہ اور ان کے ہمتیوں کے ساتھ بحث کرتے ہوئے کہنے لگا:

”کیا تم لوگوں کو یاد نہیں ہے کہ ایک دن پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ہم سب کو حکم دیا تھا کہ حاکم اور امیر المؤمنین کی حیثیت سے حضرت علیؑ علیہ السلام کو سلام کرو اور کہو: ”السلام علیک یا امیر المؤمنین“ اب کیا ہوا ہے کہ تم لوگ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وصیت اور سفارش کو فراموش کر بیٹھے؟

خلیفہ نے ”بریدہ“ کے سوال کے جواب میں دونوں منصبوں کو جدا کرنے کا اپنا نظریہ بیان کرتے ہوئے کہا: خدائے تعالیٰ ہر دن ایک کام کے بعد دوسرا کام انجام دیتا ہے اور ایک خاندان میں نبوت (معنوی قیادت) اور حکمرانی کو جمع نہیں کرتا۔

یعنی پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اہل بیت یا امت کے معنوی پیشوا ہوں گے تاکہ احکام و شریعت الہی کو بیان کریں یا حکمران، یہ دونوں منصب ایک ساتھ جمع نہیں ہو سکتے، خلیفہ کی بات پر ذرا دقت سے غور کریں ان کا مقصد یہ نظر نہیں آتا کہ یہ دو منصب ہرگز کبھی

ایک ساتھ جمع نہیں ہو سکتے، کیونکہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ان دونوں منصبوں کے مالک تھے۔ آپ مسلمانوں کے حاکم بھی تھے اور معنوی قائد بھی۔ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے علاوہ حضرت سلیمان جیسے دوسرے پیغمبر بھی ان دونوں عہدوں پر فائز تھے۔

یقیناً ان کا مقصد یہ تھا کہ پیغمبر کی رحلت کے بعد یہ دو مقام اور منصب آنحضرتؐ کے خاندان میں جمع نہیں ہوں گے، لیکن یہ نظریہ بھی گزشتہ نظریہ کی طرح باطل اور بے بنیاد ہے۔ لہذا جب حضرت امام باقر علیہ السلام اصحاب سفید کے اس نظریہ ”جدائی“ کو نقل کرتے تھے تو فوراً مندرجہ ذیل آیت شریفہ، جو فرزند ان ابراہیم میں ان دونوں منصبوں کے جمع ہونے کی حکایت کرتی ہے— سے اس نظریہ کو باطل قرار دیتے تھے۔

﴿إِنَّمَا يَحْسُدُونَ النَّاسَ عَلَىٰ مَا آتَاهُمُ اللَّهُ مِنْ فَضْلِهِ فَقَدْ آتَيْنَا آلَ إِبْرَاهِيمَ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَآتَيْنَاهُمْ مُلْكًا عَظِيمًا﴾^۱
 یا وہ ان لوگوں سے حسد کرتے ہیں جنہیں خدا نے اپنے فضل و کرم سے بہت کچھ عطا کیا ہے تو پھر ہم نے آل ابراہیم کو کتاب و حکمت اور ملک عظیم (بڑی فرمانروائی) سب کچھ عطا کیا ہے“

امام باقر علیہ السلام نے مذکور آیت شریفہ کی تلاوت کے بعد فرمایا:

”فَكَيْفَ يَقْرُونَ فِي آلِ إِبْرَاهِيمَ وَ يَنْكُرُونَ مِنْ آلِ مُحَمَّدٍ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَآلِهِ وَسَلَّمَ“

پس یہ لوگ کس طرح ان دونوں منصبوں کے خاندان ابراہیمؑ میں جمع ہونے کا اعتراف کرتے ہیں، لیکن اسی چیز کے خاندان محمدؐ میں جمع ہونے کا انکار کرتے ہیں“

عیسائی تفکر

حقیقت میں ان دونوں منصبوں کا ایک دوسرے سے جدا ہونا، ایک قسم کا عیسائی تفکر ہے جو اس نظریہ کے مفکروں کی زبان پر جاری ہوا ہے۔ کیونکہ یہ موجودہ تخریف شدہ عیسائی دین ہے جو یہ کہتا ہے کہ میں اس امر پر مامور ہوں کہ امور قیصر کو خود قیصر کو سونپ دوں، لیکن دین اسلام کے تمام قوانین ایک مکمل مادی و معنوی ضابطہ حیات کی حکایت کرتے ہیں کہ جو بشری تمام سماجی، اخلاقی، سیاسی اور اقتصادی ضرورتوں کو پورا کر سکتا ہے۔

دین اسلام، جس کی بنیاد اور احکام قوانین کے تانے بانے انسانی سیاست یعنی اسلامی سماج کے امور کی تدبیر کو تشکیل دیتے ہیں اس میں معنوی رہبری کو حکومت اور فرماں روائی سے جدا نہیں کیا جاسکتا ہے۔

پیشک اسلام میں لوگوں پر حکومت و فرماں روائی بذات خود مقصد نہیں ہے بلکہ اسلامی حاکم اس لحاظ سے اس منصب کو قبول کرتا ہے کہ اس کے سائے میں حق کو زندہ کر سکے اور باطل کو نابود کرے۔ امیر المؤمنین علیہ السلام حکومت کو احیائے حق کا وسیلہ جاننے کے بجائے خود حکومت کو مقصد قرار دیئے جانے پر اعتراض کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

”لألفیتم دنیاکم هذه ازهد عندی من عفضة عنز“^۱

یعنی تم لوگوں کی دنیا اور یہ حکومت جس کیلئے ہاتھ پاؤں مار رہے ہو، میری نظر میں بکری کی ناک سے بہنے والے پانی کے برابر بھی قدر و قیمت نہیں رکھتے۔

ماضی اور حال کے کچھ روشن خیال افراد یہ سوچتے ہیں کہ شیعہ و سنی کے درمیان اتحاد کا طریقہ یہ ہے کہ ان دو منصبوں کو خلفاء اور اہل بیت رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں تقسیم کر دیا جائے، حکومت

اور فرماں روائی کو خلفاء کا حق اور معنوی قیادت کو اہل بیت علیہم السلام کا حق جان لیں۔ اس طرح اس چودہ سو سالہ جھگڑے کو ختم کر دیں اور مسلمانوں کو مشرق و مغرب کی دو سامراجی طاقتوں کے خلاف متحد و طاقتور بنائیں۔

لیکن یہ نظریہ بھی غلط ہے کیونکہ اس طرح اس اتحاد کی بنیاد ایک غلط نظریہ پر قائم ہوگی جس سے ایک قسم کی عیسائیت اور سیکولرزم کی بو آتی ہے۔ ہم قرآن مجید کے واضح حکم کے خلاف ان دو منسیوں کو ایک دوسرے سے جدا کر کے اسے قربانی کے گوشت کی طرح کیوں تقسیم کریں!؟

مسلمانوں کے درمیان اتحاد و یکجہتی کیلئے دوسرا راستہ موجود ہے اور وہ ایسے مشترکات ہیں جو دونوں فرقوں میں پائے جاتے ہیں۔ کیونکہ سب ایک کتاب، ایک پیغمبر اور ایک قبلہ کی پیروی کرتے ہیں اور بہت سے اصول و فروع میں اتفاق نظر رکھتے ہیں، لہذا دوسرے مسائل میں اختلاف آپس میں ٹکراؤ اور خون ریزی کا سبب نہیں ہونا چاہیے۔ لیکن سیاسی اتحاد و یکجہتی کے تحفظ کے ساتھ ہر فرقہ کو اپنے عقائد کے صحیح اور منطقی دفاع کا پورا پورا حق ہونا چاہئے اور اپنے عقائد کے دفاع کے ساتھ ساتھ اپنے مشترک دشمن (سامراج اور صیہونزم) کے خلاف دیگر مسلمانوں کے ساتھ اتحاد و یکجہتی کی ضرورت کو فراموش نہ کرنا چاہئے۔

پندرہویں فصل

اسلامی احکام سے خلفاء کی نا آگاہی

گزشتہ گفتگو سے یہ پوری طرح ثابت ہوا کہ ایک مکمل مذہبی قیادت کیلئے دین کے اصول و فروع سے متعلق وسیع علم اور اسلامی معاشرہ کی ضرورتوں سے مکمل آگاہی ضروری ہے اور اس طرح کی مکمل آگاہی کے بغیر مذہبی قیادت ممکن نہیں ہے۔

کیونکہ بشری تخلیق کا مقصد یہی ہے کہ وہ شریعت الہی پر عمل کرتے ہوئے اور ارتقاء و کمال تک پہنچنے اور پیغمبروں کے بھیجے جانے اور شرعی قوانین کے نفاذ کا مقصد بھی اس کے سوا کچھ نہیں کہ انسان کو گمراہیوں سے بچالیا جائے اور اسے کمالات و فضائل کی طرف رہنمائی کی جائے۔ الہی قوانین پر عمل کرتے ہوئے ترقی کی منزلیں طے کرنا اس صورت میں ممکن ہے جب الہی فرائض و احکام بندوں کی دسترس میں ہوں تاکہ کمال کی راہ طے کرنے والوں کیلئے کوئی عذر و بہانہ باقی نہ رہے یا ان کی راہ سے رکاوٹیں دور کی جائیں۔

تمام احکام تک رسائی حاصل کرنے کیلئے شرط ہے کہ پیغمبر کے بعد لوگوں میں کوئی ایسا شخص موجود ہو جو سماج کی دینی ضرورتوں سے پوری طرح آگاہ ہو۔ تاکہ لوگوں کو ارتقاء و کمال کا راستہ اور صراطِ مستقیم دکھائے اور تخلیق کے مقاصد کو صحیح ثابت کرنے میں ذرا بھی غفلت سے کام نہ لے۔

خلفائے ثلاثہ کی زندگی کا مطالعہ کرنے سے واضح ہوتا ہے کہ ان میں سے کوئی ایک بھی ان

خصوصیات کا حامل نہ تھا اور احکام و لوگوں کی دینی ضروریات کے بارے میں ان کے معلومات بہت ضعیف تھے۔

قرآن مجید کے بعد اسلامی معاشرہ کو ارتقاء بخشنے کا واحد راستہ سنن و احادیث پیغمبرؐ سے آگاہی ہے کہ ان کا اعتبار اور حجیت تمام مسلمانوں کی نظر میں مسلم ہے۔ قرآن مجید نے بھی بہت سی آیات میں سنت اور احادیث پیغمبرؐ پر عمل کو ضروری قرار دیا ہے مثال کے طور پر درج ذیل آیہ شریفہ ملاحظہ ہو:

﴿مَا آتَاكُمُ الرَّسُولُ فَخُذُوهُ وَمَا نَهَاكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوا﴾

”جو رسول تمہیں دے اسے لے لو اور جس چیز سے منع کر دے اس سے رک جاؤ“

لیکن مذکورہ خلفاء اسلامی احکام کے بارے میں کوئی نمایاں آگاہی نہیں رکھتے تھے اور ان ناقص اور معمولی معلومات کے ذریعہ انسانی قافلہ کو ہرگز کمال کی منزل تک نہیں پہنچایا جاسکتا ہے، جس کیلئے خود اسلامی احکام پر عمل پیرا ہونا لازم ہے۔

احمد بن حنبل نے اپنی مسند میں جو روایتیں حضرت ابو بکر سے نقل کی ہیں ان کی کل تعداد ۸۰۰ احادیث سے زیادہ نہیں ہے^۱ جلال الدین سیوطی نے انتہائی کوشش کر کے ان کی تعداد ۱۰۴۰ تک پہنچائی ہے^۲

سراجم حضرت ابو بکر سے نقل کی گئی روایتوں کی آخری تعداد ۱۴۲ بتائی گئی ہے^۳ ان میں سے بھی بعض روایتیں نہیں ہیں بلکہ یہ باتیں ہیں جو ان سے نقل کی گئی ہیں مثلاً ایک حدیث جو ان سے نقل کی گئی ہے اور انہی ۱۴۲ احادیث میں شمار ہوتی ہے یہ جملہ ہے:

۱۔ حزاب۔

۲۔ مسند احمد، ج ۱، ص ۲۱۱۔۱۳

۳۔ تاریخ الخلفاء، ص ۵۹۔۶۶

۴۔ القدر، ج ۷، ص ۱۰۸

”ان رسول اللہ اھدی جملاً لابی جھل“

یعنی پیغمبر نے ابو جھل کو ایک اونٹ ہدیہ کے طور پر دیا“

اس کے علاوہ ان سے نقل کی گئی کئی احادیث قرآن مجید اور عقل کے منافی ہیں مثلاً درج ذیل

دو حدیثیں ملاحظہ ہوں:

۱۔ ”ان المیت ینضح علیہ حمیم بیکاء الحی“

یعنی، زندہ لوگوں کے رونے سے مردے پر گرم پانی ڈالا جاتا ہے۔

واضح ہے کہ اس حدیث کا مضمون چند لحاظ سے مردود ہے:

اولاً: میت پر معقول رونا، انسانی جذبات کی علامت ہے اور پیغمبر اکرمؐ نے اپنے بیٹے حضرت

ابراہیمؑ کے سوگ میں شدت سے آنسو بہائے تھے اور فرماتے تھے:

”پیارے ابراہیم! ہم تیرے لئے کچھ نہیں کر سکتے، تقدیر الہی نالی نہیں جاسکتی، تیری موت

پر تیرے باپ کی آنکھیں اشک بار ہیں اور اس کا دل محزون ہے، لیکن میں ہرگز ایسی

بات زبان پر جاری نہیں کروں گا کہ خدا کا سبب بنے۔“

جب پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ”جنگ مؤتہ“ میں ”جعفر ابن ابوطالب“ کی شہادت کی

خبر سے آگاہ ہوئے، تو آپؐ اس قدر روئے کہ آپ کی ریش مبارک پر آنسو جاری ہو گئے تھے۔

دوسرے یہ کہ ہم فرض بھی کر لیں کہ اس قسم کا رونا صحیح نہ ہوگا، تو آخر کسی ایک کے عمل سے دوسرا

کیوں عذاب میں مبتلا کیا جائے گا۔ قرآن مجید فرماتا ہے:

﴿وَلَا تَنْزِرُ وَاِزْرَةً وَّزَّرَ الْاٰخِرٰی﴾ ۱

۱۔ سیرۃ صلیبی، ج ۳، ص ۳۳، بحار، ج ۲۲، ص ۱۵۷۔

۲۔ مغازی و اقدی، ج ۲، ص ۶۶، بحار، ج ۲۱، ص ۵۴۔

اور کوئی شخص دوسرے کے گناہ کا بوجھ نہ اٹھائے گا۔

پھر ابو بکر کے نقل کے مطابق پیغمبر اکرمؐ نے یہ کیسے فرمادیا کہ کسی کے رونے سے، ایک بے بس مردہ عذاب میں مبتلا ہوگا!؟

۲۔ ”انما حرّ جہنّم علی امتی مثل الحمّام“

یعنی، میری امت کیلئے جہنم کی گرمی حمام کی گرمی کے مانند ہے۔

یہ بیان گناہگاروں کے گستاخ ہونے کا سبب بننے کے علاوہ، جہنم کے بارے میں قرآن مجید میں بیان شدہ نصوص کے بالکل خلاف ہے۔ جیسے ”وقودھا الناس و الحجارة“ اس کا اہدھن پتھر اور انسان ہیں اور اس آگ کے کوہ بیکر شعلے بیدار دلوں کو پگھلا دیتے ہیں

بہر حال جیسا کہ آپ نے ملاحظہ فرمایا، جو احادیث حضرت ابو بکر سے نقل ہوئی ہیں وہ یا ان کے معمولی بیانات ہیں یا وہ چیزیں ہیں جو عقل و قرآن مجید سے ٹکراؤ رکھتی ہیں۔ اور جسے حدیث کا نام دیا جائے ان میں بہت کم ملتی ہے۔

ظاہر ہے کہ ایسا شخص، ان ضعیف اور ناچیز معلومات کے ساتھ اسلامی معاشرے کو ارتقا اور کمال کی طرف رہنمائی نہیں کر سکتا اور امت کی ضروریات کو پورا نہیں کر سکتا۔

خليفة، خود اپنے ایک بیان میں اپنی معلومات سے پردہ اٹھاتے ہوئے کہتے ہیں:

”انی ولیت و لست بخیر کم و ان رأیت منی علی الحق فأعینونی و ان رأیت منی علی الباطل فسد دونی“

اے لوگو! تمہارے امور کی باگ ڈور میرے ہاتھ میں دیدی گئی ہے، جبکہ میں تم میں سے بہترین فرد نہیں ہوں، اگر تم لوگ مجھے حق پر دیکھو تو میری مدد کرو اور اگر مجھے باطل پر دیکھو تو میری مخالفت کرو اور مجھے اس کام سے روکو“

دین و مذہب کے قائد کو جس کے نقش قدم پر اسلامی معاشرے کو چلنا ہے دینی مسائل میں امت سے مدد کا محتاج نہیں ہونا چاہئے۔ یہ ہرگز مناسب نہیں ہے کہ دینی قائد بجائے اس کے کہ امت کو تخلیق کے مقصد کی طرف راہنمائی کرے اپنی غلطیاں اور گمراہیاں سدھارنے کیلئے امت سے مدد مانگے۔

خلیفہ اول کی لاعلمی کے چند نمونے

یہاں پر ہم خلیفہ کے معلومات سے متعلق چند نمونے پیش کرتے ہیں جو بذات خود دینی مسائل کے بارے میں ان کے معلومات کی سطح کے گواہ ہیں۔ یہ نمونے اس امر کی حکایت کرتے ہیں کہ وہ بہت سے روزمرہ کے مسائل کے جواب سے بھی ناواقف تھے:

۱۔ ”داوی“ کی وراثت کا مسئلہ عام مسائل میں سے ہے خلیفہ اس کے بارے میں آ گا ہی نہیں رکھتے تھے۔ ایک عورت کا پوتا فوت ہو گیا تھا اور اس نے اس سلسلے میں ان سے حکم خدا پوچھا، انہوں نے جواب دیا کہ: کتاب خدا اور پیغمبر کے ارشادات میں اس بارے میں کچھ بیان نہیں ہوا ہے۔ اس کے بعد اس عورت سے کہا: تم جاؤ، میں رسول خدا کے صحابیوں سے پوچھوں گا کہ کیا انہوں نے پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے اس سلسلے میں کچھ سنا ہے؟! مغیرہ بن شعبہ جو اسی مجلس میں موجود تھا، اس نے کہا: میں پیغمبر خدا کی خدمت میں تھا، آپ نے داوی کیلئے میراث میں سے ۱/۳ حصہ مقرر فرمایا تھا۔^۱

خلیفہ کی لاعلمی زیادہ تعجب خیز نہیں ہے بلکہ تعجب اس بات پر ہے کہ اس نے مغیرہ جیسے آلودہ اور بدکردار شخص سے حکم الہی سیکھا۔

۲۔ ایک ایسا چور خلیفہ کے پاس لایا گیا جس کا ایک ہاتھ اور ایک پاؤں کاٹا جا چکا تھا، انہوں نے حکم دیا اس کا پاؤں کاٹ دیا جائے، خلیفہ دوم نے اشارہ کیا کہ ایسے موقع پر سنت پیغمبر یہ ہے کہ ہاتھ کاٹا

جائے، اس پر خلیفہ نے اپنا نظریہ بدل دیا اور خلیفہ دوم کے نظریہ کی پیروی کی۔ ان دو نمونوں سے فقہ اسلامی کے بارے میں خلیفہ کی معلومات کے کمی کا بخوبی اندازہ کیا جاسکتا ہے اور واضح ہے کہ اس قدر معلومات کے فقدان اور مغیرہ جیسے افراد سے رجوع کرنے والے شخص کے ہاتھوں میں معاشرے کی معنوی قیادت کی باگ ڈور ہرگز نہیں دی جاسکتی ہے جس کی بنیادی شرط اسلامی احکام سے متعلق وسیع معلومات کا حامل ہونا ہے۔

خلیفہ دوم کے معلومات کا معیار

حضرت عمر نے جن احادیث کو پیغمبرؐ سے نقل کیا ہے ان کی تعداد پچاس سے زیادہ نہیں ہے۔ درج ذیل داستان خلیفہ دوم کے فقہی معلومات کی سطح کی صاف گواہ ہے:

۱۔ ایک شخص نے حضرت عمر کے پاس آ کر ان سے دریافت کیا: مجھ ہوں اور پانی تک رسائی نہیں حاصل کر سکا۔ ایسے میں میرا فریضہ کیا ہے؟

حضرت عمر نے جواب دیا: تم سے نماز ساقط ہے، خوشنہی سے ”عمار“ اس جگہ موجود تھے انہوں نے خلیفہ کی طرف رخ کر کے کہا: یاد ہے کہ ایک جنگ میں ہم دونوں مجھ ہوئے تھے اور پانی نہ ہونے کی وجہ سے، میں نے مٹی سے تیمم کر کے نماز پڑھی تھی، لیکن تم نے نماز نہیں پڑھی تھی؟ جب پیغمبرؐ سے یہ مسئلہ پوچھا گیا تو آپؐ نے فرمایا: کافی تھا اپنے ہاتھوں کو زمین پر مار کر چہرے پر ملتے یعنی تیمم کرتے۔

خلیفہ نے عمار کی طرف رخ کر کے کہا: خدا سے ڈرو؟ (یعنی اب اس بات کو بیان نہ کرنا)

عمار نے کہا: اگر آپ نہیں چاہتے تو میں اس واقعہ کو کہیں بیان نہیں کروں گا۔^۱

۱۔ سنن بیہقی، ج ۸ ص ۲۷۳۔

۲۔ سنن ابن ماجہ، ج ۱ ص ۲۰۰۔

یہ واقعہ اہل سنت کی کتابوں میں مختلف صورتوں میں نقل ہوا ہے اور یہ تمام صورتیں اس امر کی حکایت کرتی ہیں کہ خلیفہ دوم بھوب کے بارے میں جس کے پاس پانی نہ تھا حکم الہی سے بے خبر تھے۔ قرآن مجید نے دو آیتیں خلیفہ کے کانوں تک نہیں پہنچی تھیں!

ایسا شخص جو بارہ سال تک کوشش کے بعد صرف سورہ بقرہ یاد کر سکے اور اس کے شکرانہ کے طور پر قربانی کرے^۱، بھلا وہ کس طرح ان آیات تک آسانی سے رسائی حاصل کر سکتا ہے؟!

۲۔ شکایات نماز کے احکام ایسے احکام ہیں جن کی ہر مسلمان کو ضرورت ہوتی ہے، بہت کم ایسے متدین افراد پیدا ہوں گے جو ان احکام سے آشنائی نہ رکھتے ہوں اب فرادیکھئے کہ اس سلسلے میں خلیفہ کی معلومات کس سطح کی تھی؟

ابن عباس کہتے ہیں: ایک دن حضرت عمر نے مجھ سے پوچھا: اگر ایک شخص اپنی نماز کی تعداد کے بارے میں شک کرے تو اس کا فریضہ کیا ہے؟ میں نے خلیفہ کو جواب دیا کہ: میں بھی اس مسئلہ کے حکم سے واقف نہیں ہوں، اسی اثنا میں عبدالرحمان بن عوف آئے اور انہوں نے اس سلسلے میں رسول خدا کی ایک حدیث بیان کی^۲

شاید اس سلسلے میں ابن عباس کا جواب سنجیدہ نہ تھا، اور اگر رہا بھی ہو تو بھی خلیفہ کی ایسے موضوع کے سلسلہ میں نا آگاہی واقعا حیرت انگیز ہے!!

۳۔ مستحب ہے کہ عورتوں کا مہر چار سو دینار سے زیادہ نہ ہو، حتیٰ حدیث کی اصطلاح میں فقہاء اسے ”مہر النیۃ“ کہتے ہیں، لیکن اس کے باوجود ہر فرد اپنی شریک حیات کی رضامندی حاصل کرنے

۱۔ نساء، ۳۳، ما تمہ/۶۔

۲۔ الدر المنثور ج ۱، ص ۲۱۔

۳۔ مستدر احمد، ج ۱، ص ۱۹۲۔

کیلئے اس سے زیادہ مہر مقرر کر سکتا ہے۔

ایک دن خلیفہ نے منبر سے مہر زیادہ ہونے کے خلاف تنقید کی اور اس مخالفت کا اس حد تک اظہار کیا کہ اعلان کر دیا کہ مہر کی زیادتی منع ہے۔ جب خلیفہ منبر سے نیچے اترے تو ایک عورت نے سامنے آ کر ان سے سوال کیا: آپ نے عورتوں کے مہر میں اضافہ پر پابندی کیوں لگا دی، کیا خدائے تعالیٰ نے قرآن مجید میں یہ نہیں فرمایا ہے:

﴿وَآتَيْتُمْ إِخْدِيَهُنَّ قِنْطَارًا﴾^۱

اگر عورتوں میں سے ایک کو زیادہ مال دیدیا ہے تو حرج نہیں ہے“

اس وقت خلیفہ نے اپنی غلطی کا احساس کیا اور بارگاہ الہی میں رخ کر کے کہا: ”خدایا! مجھے بخش دے اور اس کے بعد کہا: تمام لوگ احکام الہی کے بارے میں عمر سے زیادہ واقف ہیں۔“ اس کے بعد دوبارہ منبر پر جا کر اپنی بات کی تردید کر دی۔

۳۔ شاید ہی کوئی ایسا شخص ہوگا جو یہ نہ جانتا ہو کہ الہی فرائض کی انجام دہی کیلئے عقل، طاقت اور بلوغ شرط ہے۔ اس کے باوجود، حضرت عمر کی خلافت کے زمانے میں ایک پاگل عورت کو بد کاری کے جرم میں خلیفہ کے حضور میں لایا گیا اور انہوں نے حکم صادر کر دیا کہ اسے سنگسار کیا جائے۔ خوشخبری سے جب مامور اسے سنگسار کرنے کیلئے لے جا رہے تھے، حضرت علیؑ سے ملاقات ہو گئی۔ امام جب حقیقت سے آگاہ ہوئے تو انھیں واپس لوٹنے کا حکم دیا۔ جب خلیفہ کے پاس پہنچے تو ان کی طرف رخ کر کے فرمایا: کیا تمہیں یاد نہیں ہے پیغمبر اکرمؐ نے فرمایا ہے: نابالغ، پاگل اور..... پر سے فرائض معاف کر دیے گئے ہیں؟

۱۔ نسا، ۲۰/

۲۔ ”کلی الناس الفقه من عمر“

۳۔ لغت، ج ۶، ص ۸۷ (۱) سنن کی مختلف اسناد سے منقول)

اس پر حضرت عمر نے ایک تکبیر کہی اور اپنا حکم واپس لے لیا۔

اس قسم کے ناحق فیصلے خلیفہ دوم کی زندگی کی تاریخ میں بہت ملتے ہیں۔ مرحوم علامہ امینی نے الغدیری کی چھٹی جلد میں احکام اسلام کے بارے میں خلیفہ کی نا آگاہی کے سو واقعات مستند حوالوں کے ساتھ ذکر کئے ہیں اور ان کا نام ”نوادر الاثر فی علم عمور“ رکھا ہے۔

ان امور کے جائزہ سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ اسلامی معاشرے کی قیادت ہرگز ایسے فرد کے ہاتھوں میں نہیں دی جاسکتی ہے جو کتاب و سنت اور فقہ اسلامی کے سلسلے میں اتنا بھی نہیں جانتا ہو کہ دیوانہ اور پاگل پر کوئی فریضہ عائد نہیں ہوتا۔

کیا عقل اس بات کی اجازت دیتی ہے کہ لوگوں کی ناموس اور اسلامی سماج کی باگ ڈور ایک ایسے شخص کے ہاتھوں میں دے دی جائے جو عاقل اور دیوانہ میں فرق نہ کر سکتا ہو؟
کیا عقل اس بات کی اجازت دیتی ہے کہ خدائے عادل لوگوں کی جان و مال کو ایک ایسے شخص کے سپرد کر دے جو یہ بھی نہ جانتا ہو کہ عورت چھ ماہ میں بچے کو جنم دے سکتی ہے اور ایسی عورت پر بدکاری کی تہمت نہیں لگائی جاسکتی اور نہ اسے سنگسار کرنے کا حکم دیا جاسکتا ہے؟

خلیفہ سوم کے معلومات کا معیار

الہی احکام کے بارے میں تیسرے خلیفہ کے معلومات بھی گزشتہ دو خلفاء سے زیادہ نہیں تھے۔ ان کے ذریعہ پیغمبر سے نقل کی گئی احادیث کی کل تعداد ۱۳۶ سے زیادہ نہیں ہے۔

اسلام کے اصول و فروع کے سلسلے میں حضرت عثمان کی آگاہی بہت کم اور ناچیز تھی قارئین کرام کی آگاہی کیلئے اسلامی تعلیمات سے ان کی بے خبری کے سلسلہ میں صرف ایک اشارہ پر

۱۔ اس کی تفصیل پانچویں فصل میں گزری ہے۔

اکتفا کی جاتی ہے:

اسلام کے واضح احکام میں سے ایک حکم یہ ہے کہ مسلمان اور کافر کا خون برابر نہیں ہے اور پیغمبر اسلام نے اس سلسلے میں فرمایا ہے:

”لا یقتل مسلم بکافر“

کافر کو قتل کرنے پر مسلمان کو قتل نہیں کیا جاسکتا، بلکہ قاتل دیت ادا کرے گا۔

لیکن افسوس ہے کہ خلیفہ سوم کی خلافت کے دوران جب ایک ایسا واقعہ پیش آیا تو خلیفہ نے

قاتل کو قتل کرنے کا حکم صادر کر دیا پھر بعض اصحاب رسولؐ کی یاد دہانی پر اپنے حکم کو بدل لیا

خلیفہ سوم کی زندگی میں ایسے بہت سے نمونے ملتے ہیں۔ بیان کو مختصر کرنے کیلئے ہم ان کی

تفصیلات سے صرف نظر کرتے ہیں اور ایک بار پھر بحث کے نتیجے کی طرف آتے ہیں:

امت اسلامیہ کی مذہبی قیادت کیلئے الہی احکام سے متعلق وسیع علم اور معلومات کا مالک ہونا

شرط ہے اور ایسا علم عصمت یعنی گناہوں سے محفوظ رہے بغیر ممکن نہیں ہے اور افسوس ہے کہ پہلے

تینوں خلفاء اس لطف الہی سے محروم تھے۔

پیغمبرؐ کے صحابی، گناہ و خطا سے معصوم نہیں

شاید مہاجرین و انصار کے ایک گروہ پر ہماری تنقید سنی برادری کے بعض افراد کیلئے تعجب کا سبب بنے اور یہ سوچیں کہ یہ کیسے ممکن ہے ان حضرات کے قول و فعل کی عیب جوئی کر کے ان کو خطا کار قرار دیا جائے جبکہ قرآن مجید نے دو موقعوں پر ان کی ستائش کی ہے:

﴿وَالسَّابِقُونَ الْأَوَّلُونَ مِنَ الْمُهَاجِرِينَ وَالنَّاصِرِ وَالَّذِينَ اتَّبَعُوهُمْ
بِإِحْسَنِ رَضِيَ اللَّهُ عَنْهُمْ وَرَضُوا عَنْهُ وَأَعَدَّ لَهُمْ جَنَّاتٍ تَجْرِي تَحْتِهَا
الْأَنْهَارُ خَالِدِينَ فِيهَا أَبَدًا ذَلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيمُ﴾

”اور مہاجرین و انصار میں سے سبقت کرنے والے اور جن لوگوں نے نیکی میں ان کا اتباع کیا ہے، ان سب سے خدا راضی ہو گیا ہے اور یہ سب خدا سے راضی ہیں اور خدا نے ان کیلئے وہ باغات مہیا کئے ہیں جن کے نیچے نہریں جاری ہیں اور یہ ان میں ہمیشہ رہنے والے ہیں اور یہی بہت بڑی کامیابی ہے“

۲۔ ایک دوسرے سورہ میں ان افراد کے بارے میں، جنہوں نے سرزمین ”حدیبیہ“ پر ایک درخت کے سایہ میں پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بیعت کی تھی، یوں فرمایا ہے:

﴿لَقَدْ رَضِيَ اللَّهُ عَنِ الْمُؤْمِنِينَ إِذْ يُبَايِعُونَكَ تَحْتَ الشَّجَرَةِ فَعَلِمَ مَا فِي قُلُوبِهِمْ فَأَنْزَلَ السَّكِينَةَ عَلَيْهِمْ وَأَثَابَهُمْ فَتْحًا قَرِيبًا﴾

”یقیناً خدا صاحبانِ ایمان سے اس وقت راضی ہو گیا جب وہ درخت کے نیچے آپ کی بیعت کر رہے تھے پھر اس نے وہ سب کچھ دیکھ لیا جو ان کے دلوں میں تھا تو ان سب پر سکون نازل کر دیا اور انہیں اس کے عوض قریبی فتح عنایت کر دی“۔

خلاصہ: پہلی آیہ کریمہ میں خدائے تعالیٰ مہاجرین و انصار میں سے ان افراد کی ستائش کرتا ہے جو دوسرے لوگوں سے پہلے اسلام لائے اس کے بعد ان افراد کی بھی تعریف کرتا ہے جنہوں نے ان میں سے کسی ایک کی پیروی کی ہو۔

دوسری آیہ شریفہ میں، خداوند کریم ان افراد کے بارے میں رضا مندی اور خوشنودی کا اظہار کر کے انہیں آرام و سکون اور فتح مکہ کی بشارت دیتا ہے، جنہوں نے ساتویں ہجری کو سرزمینِ حدیبیہ پر پیغمبرؐ کی بیعت کی تھی۔

خدائے تعالیٰ کی طرف سے اس ستائش اور اظہارِ خوشنودی کے ہوتے ہوئے کس طرح ممکن ہے کہ پیغمبر اکرمؐ کی رحلت کے بعد رسول کے اصحاب اپنے فیصلوں میں خطایا گناہ کے مرتکب ہوتے ہوں!؟

مذکورہ بالا آیات کے مقاصد کی وضاحت کرنے سے پہلے ایک مطلب کی طرف اشارہ کرنا ضروری ہے اور وہ یہ ہے کہ اہل سنت کے علماء نہ فقط ان دو گروہوں (مہاجرین و انصار اور تابعین) کو جن کے بارے میں ان دو آیتوں میں اشارہ ہوا ہے۔ عادل اور پاک دامن جانتے ہیں بلکہ ان کی اکثریت کا اعتقاد یہ ہے کہ تمام اصحاب رسولؐ عادل، منصف، متقی اور پرہیزگار تھے۔ مگر یہ کہ کسی ایک کے بارے میں کسی واقعہ میں فسق و انحراف ثابت ہو جائے۔

مختصر یہ کہ جس کسی نے پیغمبر اسلامؐ کی مصاحبت کا شرف حاصل کیا ہے اسے عادل اور پاک دامن جاننا چاہئے، مگر یہ کہ اس کے برخلاف کچھ ثابت ہو جائے۔

اس جملہ کا مفہوم یہ ہے کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے صحابیوں جن کی تعداد ایک لاکھ سے زیادہ ہے، کے تانے بانے ہی جدا ہیں، یعنی جوں ہی کوئی فرد پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حضور مشرف ہوتا تھا، ایک روحانی انقلاب پیدا کر کے اس لمحہ کے بعد اپنی پوری زندگی میں صحیح، عادل اور پاک دامن ہونے کی سند حاصل کر لیتا تھا۔

صحابیوں کے بارے میں ایسی بات کہنا، ان میں سے ایک گروہ کی بدکرداری پر پردہ ڈالنے کے مترادف ہے، کیونکہ ایسے افراد کا ضعیف عمل اور بعض مواقع، جیسے، جنگ احد و جنگ حنین میں ان کا فرار کرنا ان کے ایمان میں کمزوری خود رسالت مآب اور آپؐ کے عالی مقاصد کے تئیں ان کی بے توجہی کی واضح دلیل ہے قارئین کرام جنگ "احد" میں پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ ان کی بے وفائی کے بارے میں نازل شدہ آیات کی تحقیق کر کے حقیقت کو بخوبی محسوس کر سکتے ہیں۔ یہ کس طرح کہا جاسکتا ہے کہ تمام صحابی عادل اور پاک دامن تھے، جبکہ قرآن مجید ان کے ایک گروہ کے حلقہ منافقین میں ہونے کے بارے میں یوں فرماتا ہے:

﴿وَإِذْ يَقُولُ الْمُنَافِقُونَ وَالَّذِينَ فِي قُلُوبِهِمْ مَرَضٌ مَا وَعَدَنَا اللَّهُ وَرَسُولُهُ
إِلَّا غُرُورًا﴾

”اور جب منافقین اور جن کے دلوں میں مرض تھا، یہ کہہ رہے تھے کہ خدا اور اس کے رسولؐ نے ہم سے جو وعدہ کیا تھا وہ سراسر دھوکہ ہے“

کیا ایسی بات کہنے والوں کو عادل و منصف کہا جاسکتا ہے؟ جبکہ ایسا کہنے والے کو حقیقی مسلمان

بھی نہیں کہا جاسکتا ہے۔

قرآن مجید صحابہ کے ایک گروہ کا تعارف ’سماعون‘ کی حیثیت سے کراتا ہے۔

اس لفظ سے مراد وہ افراد تھے جو منافقین کی باتوں کو فوراً قبول کر لیا کرتے تھے، فرماتا ہے:

﴿لَوْ خَرَجُوا فِيكُمْ مَا زَادُواكُمْ إِلَّا خَبَالًا وَلَا وُضِعُوا خِلَالَكُمْ يَبْغُونَكُمُ
الْفِتْنَةَ وَفِيكُمْ سَمْعُونُ لَهُمْ وَاللَّهُ عَلِيمٌ بِالظَّالِمِينَ﴾

اگر یہ (منافقین) تمہارے ساتھ نکل بھی پڑتے تو تمہاری وحشت میں اضافہ ہی کرتے

اور تمہارے درمیان فتنہ کی تلاش میں گھوڑے دوڑاتے پھرتے اور تم میں ایسے لوگ بھی

تھے جو ان کی باتوں کو خوب سننے والے تھے اور اللہ تو ظالمین کو اچھی طرح جانتا ہے۔^۱

اس گروہ کے تمام افراد کو کیسے عادل و پاک دامن جانا جاسکتا ہے، جبکہ خالد بن ولید (بعض

اہل سنت مصنفین کے عقیدہ کے مطابق اس نے پیغمبرؐ سے ’سیف اللہ‘ کا لقب حاصل کیا تھا) فتح

مکہ کے سال ایک خطرناک جرم کا مرتکب ہوا اور قبیلہ ’بنی خزیمہ‘ کی ایک جماعت کو ضمانت اور عہد

و پیمان کے بعد دھوکہ و فریب سے قتل عام کر ڈالا۔ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جب اس

مجرمانہ حرکت کی خبر سنی تو قبلہ کی طرف رخ کر کے کھڑے ہوئے اور اپنے ہاتھوں کو بلند کر کے

’استغاثہ‘ کی حالت میں فرمایا:

”اللهم انى ابرء اليك مما صنع خالد بن الوليد“

خدا! جو کچھ خالد بن ولید نے انجام دیا ہے، میں اس سے بیزار ہوں۔^۲

اس نام نہاد ’سیف اللہ‘ کے کارناموں کی سیاہ فائل یہیں پر بند نہیں ہوتی بلکہ پیغمبر اسلامؐ

کی رحلت کے بعد مالک بن نویرہ اور اس کے قبیلہ کے ساتھ کئے گئے اس کے بیہیمانہ جرائم تاریخ کے

صفحات میں ضبط ہو چکے ہیں۔ اس نے مالک کو۔ جو ایک مسلمان تھا۔ قتل کر ڈالا اور اس کی بیوی کے ساتھ اسی شب اپنا منہ کالا کیا۔

حق و باطل پہچاننے کا راستہ

اصولی طور پر یہ سب سے بڑی غلطی ہے کہ ہم حق و باطل کو افراد کے ذریعہ پہچانیں اور ان کی رفتار و گفتار کی حقانیت کیلئے ان کی شخصیت کو معیار قرار دیں، جبکہ ایک شخص کا عقیدہ اور قول و فعل اس کی حقانیت کی علامت ہوتا ہے، نہ کہ برعکس۔

”برینڈرسل“ علم ریاضی کا ایک بڑا دانشور ہے اور ریاضیات میں اس کے نظریے نمایاں اور علماء کے لئے قابل قبول ہیں، لیکن اس کے باوجود وہ ایک ملحد ہے اور خدا و الہی مقدمات کا منکر شمار ہوتا ہے، وہ اپنی کتاب ”میں کیوں عیسائی نہیں ہوں“ میں خدا پرستوں کے دلائل سے ناواقفیت کے سبب صراحت کے ساتھ لکھتا ہے:

”میں ایک زمانے میں خدا پرست تھا اور اس کی بہترین دلیل ”علت العلیل“ جانتا تھا لیکن بعد میں اس عقیدہ سے پھر گیا۔ کیونکہ میں نے سوچا اگر ہر چیز کیلئے ایک علت اور خالق کی ضرورت ہے تو خدا کیلئے بھی ایک خالق ہونا چاہئے“

کیا عقل ہمیں اس بات کی اجازت دیتی ہے کہ ”رسل“ کی شخصیت کو خدا کے بارے میں اس کے فاسد فلسفی نظریہ۔ جبکہ کائنات کے تمام ذرات خدا کے وجود کی گواہی دیتے ہیں۔ کے صحیح ہونے کی بنیاد قرار دیں؟ واضح ہے کہ ہمیں اپنے فیصلوں میں افراد کی علمی و سیاسی شخصیت سے متاثر نہیں ہونا چاہئے اور ان کے افکار و اعتقاد اور قول و فعل کو ہر طرح کے حب و بغض سے اوپر اٹھ کر صرف عقل و منطق کے معیار پر تولنا چاہئے۔

یہاں مناسب ہے کہ ہم اس موضوع کے بارے میں امیر المؤمنین علیہ السلام کے پائیدار اور مستحکم نظریہ کی طرف بھی اشارہ کر دیں۔

جنگِ جمل میں کچھ لوگ حضرت علیؑ کے طرفدار اور کچھ لوگ طلحہ، زبیر اور ام المؤمنین عائشہ کے طرفدار تھے۔ اس حالت میں دودلی کا شکار ایک آدمی جو حضرت علیؑ کی عظیم شخصیت سے بھی آگاہ تھا، آگے بڑھا اور بولا:

”کیسے ممکن ہے کہ یہ لوگ باطل پر ہوں، جبکہ ان کے درمیان طلحہ، زبیر اور ام المؤمنین عائشہ جیسی شخصیتیں موجود ہیں، کیا یہ کہا جاسکتا ہے کہ ان افراد نے باطل کا راستہ اختیار کیا ہوگا؟! امیر المؤمنینؑ نے اس کے جواب میں ایک ایسی بات بیان فرمائی کہ مصر کا مشہور دانشور ڈاکٹر طہ حسین اس کے بارے میں کہتا ہے:

”وحی کا سلسلہ بند ہونے کے بعد انسان کے کانوں نے اب تک ایسی با عظمت بات نہیں سنی ہے“

امامؑ نے فرمایا:

”انک لملبوس علیک، ان الحق و الباطل لا يعرفان باقدار الرجال ،

اعرف الحق تعرف اہلہ ، اعرف الباطل تعرف اہلہ“

یعنی تم نے حق و باطل کو پہچاننے کے معیار میں غلطی کی ہے۔ حق و باطل ہرگز افراد کے ذریعہ نہیں پہچانے جاتے، بلکہ پہلے حق کو پہچانا چاہئے پھر اہل حق کو پہچانا جاسکتا ہے، پہلے باطل کو پہچانا چاہئے پھر اہل باطل کی تمیز دی جاسکتی ہے۔

امیر المؤمنینؑ کی یہ عظیم فرمائش — کہ بقول ڈاکٹر طہ حسین، وحی الہی کے بعد انسان کے کانوں نے ایسا کلام نہیں سنا ہے — بعض سنی علماء کے اس اصول کو پوری طرح بے بنیاد ثابت کرتا ہے کہ پیغمبر اسلامؐ کے تمام اصحاب عادل ہیں۔

اب ہم یہاں پر قرآن مجید کی مذکورہ بالا دو آیتوں کے سلسلہ میں بحث کرتے ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ پہلی آیت اس امر کی حکایت کرتی ہے کہ خدائے تعالیٰ دو گروہوں سے راضی ہوا ہے اور اس نے اپنی بہشت کو ان کیلئے آمادہ کیا ہے۔ یہ دو گروہ حسب ذیل ہیں:

۱۔ مہاجرین و انصار کا ایک گروہ، جنہوں نے ایمان اور اسلام لانے میں دوسرے لوگوں پر سبقت حاصل کی ہے اور نازک لمحات میں دین کی راہ میں قربانیاں دی ہیں۔

۲۔ وہ لوگ جنہوں نے شائستہ طور پر مہاجرین و انصار کی پیروی کی ہے۔

قرآن مجید نے پہلے گروہ کے بارے میں ﴿السَّابِقُونَ الْأَوَّلُونَ﴾ اور دوسرے گروہ کے بارے میں ﴿وَالَّذِينَ اتَّبَعُوهُمْ بِإِحْسَانٍ﴾ کی اصطلاح استعمال کی ہے۔

لیکن قابل غور امر یہ ہے کہ کیا، جو چیز ان سے خدا کی خوشنودی و رضامندی کا سبب بنی صرف ان کی اسلام اور پیغمبر پر ایمان لانے میں سبقت تھی، اور کیا اس خوشنودی و رضامندی کی بقاء و دوام بلا قید و شرط ہے؟

واضح تر الفاظ میں: کیا اگر یہ افراد بعد والے زمانوں میں فکری یا اختلافی انحراف کا شکار ہو کر ظلم و جبر کے مرتکب ہو جائیں، تو کیا پھر بھی وہ خدا کی رضامندی اور خوشنودی کے حقدار ہوں گے اور قہر و غضب ان کے شامل حال نہیں ہوگا؟ یا یہ کہ اسلام لانے میں ان کی سبقت کیلئے خدا کی رضا مندی اور خوشنودی کا باقی رہنا اس امر پر مشروط ہے کہ ان کا ایمان و عمل صالح ان کی زندگی کے تمام ادوار میں باقی رہے، اور اگر ان دو شرائط،، میں ان کی زندگی میں کبھی خلل پیدا ہو جائے تو ان کی اسلام میں سبقت اور مہاجر و انصار کے عنوان کا کوئی فائدہ نہیں ہوگا؟

قرآن مجید کی دیگر آیات کی تحقیق سے قطعی طور پر دوسرے نظریہ کی تائید ہوتی ہے کہ خدا کی طرف سے اپنے بندوں کیلئے کامیابی اور خوشنودی کی بقا اسی شرط پر ہے کہ وہ اپنی پوری زندگی میں ایمان اور عمل صالح پر قائم و دائم رہیں۔ ملاحظہ ہوں اس قسم کی چند آیات کے نمونے:

قرآن مجید سورہ حشر میں مہاجرین کی ایک جماعت کی اس بات پر ستائش کرتا ہے کہ انہوں نے اپنا سب مال و منال چھوڑ کر مدینہ ہجرت کی تھی، اس کے بعد ان کی ستائش کا سبب مندرجہ ذیل عبارتوں میں بیان فرمایا ہے۔

﴿يَسْتَعِينُونَ فَضْلًا مِّنَ اللَّهِ وَرِضْوَانًا وَيَنْصُرُونَ اللَّهَ وَرَسُولَهُ﴾

وہ لوگ ہمیشہ خدا کے فضل و کرم اور اس کی مرضی کے طلبگار رہتے ہیں اور خدا و رسول کی مدد کرنے والے ہیں۔

یہ آیت شریفہ اس بات کی حکایت کرتی ہے کہ انسان کی نجات کیلئے ہجرت کرنا گھبرایا اور مال و منال کو چھوڑنا ہی کافی نہیں ہے بلکہ خدا کی خوشنودی کے اسباب فراہم کرنے کی مسلسل کوشش کرنا اور اپنے نیک اعمال کے ذریعہ خدا اور اس کے رسولؐ کی مدد کرنا بھی ضروری ہے۔

قرآن مجید فرماتا ہے: فرشتے، جو عرش کے اطراف میں خدائے تعالیٰ کی تسبیح کرتے ہیں، با ایمان افراد کیلئے اس طرح دعائے مغفرت کرتے ہیں:

﴿فَاغْفِرْ لِلَّذِينَ تَابُوا وَاتَّبَعُوا سَبِيلَكَ﴾

”خدا یا! جو تیری طرف لوٹ آئے ہیں اور تیرے دین کی پیروی کرتے ہیں، انہیں بخش دے“

قرآن مجید اصحابِ پیغمبرؐ میں سے ان افراد کی ستائش کرتا ہے جو کافروں کے ساتھ سختی سے پیش آتے ہیں اور آپس میں مہربان ہیں، رکوع و تہجد بجالاتے ہیں، خدا کے کرم و خوشنودی کے طالب ہیں اور ان کے چہروں پر سجدوں کی نشانیاں نمایاں ہیں۔

۱-حشر/۸۔

۲- ﴿مُحَمَّدٌ رَسُولُ اللَّهِ وَالَّذِينَ مَعَهُ أَشِدَّاءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَاءُ بَيْنَهُمْ تَرَاهُمْ رُكَّعًا سُجَّدًا يَبْتَغُونَ فَضْلًا مِّنَ اللَّهِ وَرِضْوَانًا سِيمَاهُمْ فِي وُجُوهِهِمْ مِّنْ أَثَرِ السُّجُودِ﴾ (فتح/۲۹)

اس کے علاوہ قرآن عفو و بخشش اور عظیم اجر کا حقداران اصحاب رسول کو جانتا ہے جو خدا پر ایمان لائے اور نیک اعمال انجام دیتے ہیں^۱

مذکورہ آیات اور ان کے علاوہ دیگر آیات اس بات کی گواہ ہیں کہ مہاجرین و انصار یا سابقین و تابعین کے عنوان، سعادت مند و نجات یافتہ ہونے کے لئے کافی شرط نہیں ہیں بلکہ اس فضیلت کے ضمن میں دیگر فضائل، جیسے نیک اعمال کی انجام دہی اور بُرے کاموں سے پرہیز کی شرط بھی ضروری ہے، ورنہ یہ لوگ درج ذیل آیات کے زمرے میں شامل ہوں گے:

۱۔ ﴿فَإِنَّ اللَّهَ لَا يَرْضَىٰ عَنِ الْقَوْمِ الْفَاسِقِينَ﴾

خدا تعالیٰ فاسقوں کے گروہ سے راضی نہیں ہوتا۔^۲

۲۔ ﴿وَاللَّهُ لَا يُحِبُّ الظَّالِمِينَ﴾

خدا تعالیٰ ظالموں کو دوست نہیں رکھتا۔^۳

پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ایمان کے بلند ترین مقام پر فائز اور فضیلت و اخلاق کا نمونہ تھے، لیکن پھر بھی خدا تعالیٰ واضح الفاظ میں آپ کو خبردار کرتے ہوئے فرماتا ہے:

﴿لَئِنْ أَسْرَحْتَ لَيُحْبَطَنَّ عَمَلُكَ وَ لَتَكُونَنَّ مِنَ الْخَاسِرِينَ﴾^۴

اگر تم شرک اختیار کرو گے تو تمہارے تمام اعمال برباد ہو جائیں گے اور تمہارا شمار گھٹانا اٹھانے والوں میں ہوگا۔

پیشک پیغمبر اکرم کا قوی ایمان اور آپ کی عصمت ایک لمحہ کیلئے بھی آپ کو شرک کی طرف مائل

۱۔ ﴿وَعَدَ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ مِنْهُمْ مَغْفِرَةً وَأَجْرًا عَظِيمًا﴾ (فتح/۲۹)

۲۔ توبہ/۹۶۔

۳۔ آل عمران/۵۷۔

۴۔ زمر/۶۵۔

نہیں کر سکتی، لیکن یہاں پر قرآن مجید آپ سے مخاطب ہو کر درحقیقت دوسروں کو خبردار کرتا ہے کہ چند نیک اعمال کے دھوکے میں نہ رہیں بلکہ کوشش کریں کہ زندگی کی آخری سانس تک اسی نیک حالت پر باقی رہیں۔

اس بنا پر ہمیں ہرگز یہ تصور نہیں کرنا چاہئے کہ پیغمبر کا صحابی ہونا اور سابقین و تابعین کے زمرے میں شمار ہونا کسی کو ایسا تحفظ بخش دے گا کہ اگر وہ بعد میں کوئی غلط قدم بھی اٹھائے، پھر بھی خدا کی خوشنودی کا مستحق قرار پائے گا۔

ان ہی مہاجرین اور انصار یا سابقین و تابعین میں سے بعض افراد خود پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے زمانے میں ہی مرتد ہو گئے تھے اور پیغمبر خدا کی جانب سے انہیں سخت ترین سزا کا حکم سنا دیا گیا، اس وقت کسی نے بھی اعتراض نہیں کیا کہ: اے پیغمبر! خداوند کریم ان سے راضی ہو گیا ہے، آپ انہیں کیوں یہ سخت سزا سنارہے ہیں؟

اس سیاہ فہرست کے چند نمونے ملاحظہ ہوں:

۱۔ عبد اللہ بن سعد بن ابی سرح: وہ مہاجرین میں سے تھا اور کاتب وحی تھا اس کے بعد مرتد ہو گیا اور اس نے کہا:

﴿سَأَنْزِلُ مِثْلَ مَا أَنْزَلَ اللَّهُ﴾

میں بھی خدا کی طرح کی باتیں نازل کر سکتا ہوں!

فتح مکہ میں پیغمبر اسلام نے چند افراد کے قتل کا حکم دیدیا اور فرمایا: جہاں کہیں وہ ملیں انہیں فوراً قتل کر دیا جائے، ان میں سے ایک یہی ”عبد اللہ“ تھا، لیکن فتح مکہ کے بعد اس نے حضرت عثمان کے وہاں پناہ لے لی، کیونکہ وہ حضرت عثمان کا رضاعی بھائی تھا۔ حضرت عثمان کی سفارش اور اصرار کے سبب پیغمبر اکرم نے اسے چھوڑ دیا۔

پیغمبر اس شخص سے اس قدر نفرت کرتے تھے کہ اس کو معاف کرنے کے بعد آنحضرت نے اپنے اصحاب سے فرمایا: جب تم لوگوں نے دیکھا کہ میں اسے معاف کرنے سے انکار کر رہا ہوں اس وقت تم لوگوں نے اسے قتل کیوں نہیں کر ڈالا؟

۲۔ عبید اللہ بن جحش: وہ اسلام کے سابقین اور مہاجرین حبشہ میں سے تھا، لیکن حبشہ ہجرت کرنے کے بعد اسلام چھوڑ کر اس نے عیسائی دین قبول کر لیا۔

۳۔ حکم بن عاص: وہ ان لوگوں میں سے تھا جو فتح مکہ کے بعد ایمان لائے تھے، لیکن پیغمبر اسلام نے چند جوہات کی بنا پر اسے طائف جلاوطن کر دیا۔

۴۔ حرقوص بن زہیر: اس نے بیعت رضوان میں شرکت کی تھی، لیکن غنائم کی تقسیم پر اس نے پیغمبر اسلام سے تند کلامی کی اس پر رحمۃ اللعالمین پیغمبر پر ہم ہو گئے اور فرمایا: وائے ہوتم پر، اگر میں انصاف و عدالت کی رعایت نہ کروں گا تو کون انصاف کرے گا؟ اس کے بعد اس کے خطرناک مستقبل کے بارے میں فرمایا: حرقوص ایک ایسے گروہ کا سردار بنے گا جو دین اسلام سے اسی طرح دور ہو جائیں گے جس طرح کمان سے تیر نکل کر دور جاتا ہے“۔

پیغمبر اسلام کی یہ پیشین گوئی آپ کی رحلت کے سالہا بعد حقیقت ثابت ہوئی۔ یہ شخص خوارج کا سردار بنا اور جنگ نہروان میں حضرت علی کی تلوار سے قتل ہوا۔

یہ اس سیاہ فہرست کے چند نمونے تھے جس میں بہت سے اصحاب پیغمبر (مہاجر و انصار) موجود ہیں۔ پیغمبر اسلام کے صحابیوں کی تحقیق کے دوران ہمیں چند دوسرے افراد بھی نظر آتے ہیں: جیسے:

حاطب بن ابی بلتعہ، جو اسلام کے خلاف جاسوسی کرتا تھا یا ولید بن عقبہ، جسے قرآن مجید نے سورہ حجرات ۱ میں فاسق کہا ہے یا خالد بن ولید، جس کا نامہ اعمال اس کے کالے کروتوتوں سے بھر پڑا ہے ۱

کیا صحابیوں میں ایسے افراد کی موجودگی کے باوجود بھی یہ کہا جاسکتا ہے کہ خدائے تعالیٰ سابقین اور تابعین سے راضی ہو چکا ہے اب کسی کو بھی ان کی طرف ٹیڑھی نگاہ سے دیکھنے کا حق نہیں ہے؟

مختصر یہ کہ خدا کی رضا و خوشنودی، ان کے عمل سے مربوط ہے، یعنی خدائے تعالیٰ ان افراد سے راضی و خوشنود ہوا ہے، جنہوں نے غربت کے زمانے میں اسلام اور رسول خدا کی حمایت و مدد کی ہے لیکن اس قسم کی خوشنودی کا اظہار اس بات کی دلیل نہیں ہے کہ ان کی یہ خوشنودی ان افراد کی زندگی کی آخری سانس تک باقی رہے گی۔ بلکہ اس کی بقا کی شرط یہ ہے کہ ان کا ایمان اسی حال میں باقی رہے اور وہ ایسا کوئی کام انجام نہ دیں جو ان کے کفر، ارتداد، فسق اور اعمال صالح کے برباد ہو جانے کا سبب بنے۔

دوسرے الفاظ میں، مہاجرین و انصار کا ایمان و اخلاص، بھی دوسرے نیک اعمال کی طرح اس پر مشروط ہے کہ بعد میں کوئی ایسا کام انجام نہ دیں جو ان کے اس عمل کو بے اثر بنا کر دے ورنہ ان کا یہ نیک عمل باقی نہ رہے گا۔ علماء کی اصطلاح میں جس پاداش کا اس آیت میں ذکر ہوا ہے (رضا مندی و بہشت) یہ ایک ”نسبی“ پاداش ہے۔ یعنی وہ اس لحاظ سے ایسی پاداش کے حقدار ہیں لیکن اس سے بھی انکار نہیں ہے کہ اگر یہی لوگ بعد میں خدا کی نافرمانی کے کام انجام دیں گے تو غضب الہی اور جہنم کے مستحق ہو جائیں گے۔

اس قسم کی آیات کا ہرگز یہ مطلب نہیں ہے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سابق صحابیوں کو تحفظ بخش دیں چونکہ خداوند تعالیٰ ان سے خوشنود ہو گیا ہے، لہذا وہ جو چاہیں انجام دیں یا ان میں سے اگر کوئی کسی غیر شرعی کام کا مرتکب ہو گیا ہو تو ہم اس آیت کے حکم کی تاویل و تحریف پر مجبور ہوں کیونکہ اس آیت نے ان کے سلسلے میں قطعی حکم صادر کر دیا ہے!

نہیں ایسی ضمانت انبیاء اور اولیاء میں بھی کسی کو نہیں ملی ہے حتیٰ خود رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو بھی ایسی ضمانت نہیں ملی ہے۔

قرآن مجید حضرت ابراہیم اور ان کے فرزندوں جیسے اسحاق، یعقوب، موسیٰ و ہارون وغیرہ کے بارے میں فرماتا ہے:

﴿وَلَوْ أَنشَرَكُوا لَلْحَبِطُ عَنْهُمْ مَا كَانُوا يَعْمَلُونَ﴾

اگر یہ لوگ شرک اختیار کر لیتے تو ان کے سارے اعمال برباد ہو جاتے۔“

سترہویں فصل

حضرت علیؑ کی پیشوائی کے نقلی دلائل

گزشتہ بحثوں میں یہ ثابت ہوا کہ خدا کی طرف سے امام کا تعین دنیاوی ”مطلق العنان“ نظام سے بالکل مختلف ہے، لوگوں میں قوانین الہی کی روشنی میں حکم کرنے اور انصاف قائم کرنے کیلئے جو حاکم خدا کی طرف سے معین ہوتا ہے، اس کی حکومت روئے زمین پر قابل تصور حکومتوں میں سب سے زیادہ عادل اور مستحکم حکومت ہے۔

اس قسم کی حکومت میں، حاکم و فرمان روا خدا کی طرف سے منتخب ہوتا ہے۔ خدا بھی اپنے حکیمانہ ارادہ سے ہمیشہ بہترین و شائستہ ترین فرد کو رہبر کے عنوان سے منتخب کرتا ہے اور خدا کے علم و تشخیص میں کسی بھی قسم کی غلطی و خطایا غیر منطقی میلان کا امکان نہیں پایا جاتا۔

خدائے تعالیٰ انسان کے بارے میں مکمل آگاہی رکھتا ہے اور اپنے بندوں کے بارے میں ان کی مصلحتوں اور ضرورتوں سے ان سے زیادہ واقف ہے۔ جس طرح خدا کے قوانین اور احکام بہترین اور عالی ترین قوانین و احکام ہیں اور کوئی بھی قانون خدا کے قانون کے برابر نہیں ہے، اسی طرح خدا کی طرف سے معین شدہ پیشوا اور رہبر بھی بہترین پیشوا اور شائستہ ترین رہبر ہوگا ایک ایسا قائد و فرمان روا جس کی زندگی دسیوں سہو و خطا اور نفسانی خواہشات سے آلودہ ہو وہ خدا کی طرف

سے منتخب شدہ رہبر و قائد کا ہم پلہ ہرگز نہیں ہو سکتا ہے۔

گزشتہ بحثوں میں یہ بھی ثابت ہوا کہ اسلامی معاشرہ ہمیشہ ایک ایسے معصوم امام کا محتاج ہے جو الہی قوانین اور احکام سے آگاہ ہوتا ہے، کہ امت کیلئے فکری اور علمی پناہ گاہ بن سکے۔

اصولی طور پر اسلامی معاشرہ فکری اور علمی لحاظ سے ارتقاء کی اس حد تک نہیں پہنچا تھا کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رحلت کے بعد اپنا نظم و نسق خود سنبھال سکے اور اس قسم کے ایک الہی رہبر سے بے نیا ہو جائے۔

اب ہم غور کریں اور دیکھیں کہ ان تمام حالات کے تناظر میں پیغمبر الہی نے اسلامی امت کی قیادت کیلئے کس کو معین فرمایا تھا اور اس مسئلہ کو ہمیشہ کیلئے حل کر دیا تھا۔

یہاں پر ہم ایسے نقلی دلائل کا سہارا لیتے ہیں وہ دلائل جو قطعی طور سے پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے صادر ہوئے اور اصطلاحاً متواتر ہیں اور ان میں جھوٹ اور جعل سازی کا ہرگز امکان نہیں ہے۔ اس کے علاوہ ایسی روایتوں کا مفاد یہ ہے کہ ان کی دلالت کسی خاص فرد یا افراد کی امامت و پیشوائی کے بارے میں اتنی واضح اور روشن ہو کہ ہر قسم کے شک و شبہ کو دلوں سے نکال دے اور کسی بھی انصاف پسند انسان کیلئے سوال اور تذبذب کی گنجائش باقی نہ رہے۔

لہذا ہم یہاں پر چند ایسے نقلی دلائل کی طرف اشارہ کریں گے جن کی روایت پیغمبر اکرمؐ سے قطعی اور مقصود کے بارے میں ان کی دلالت بھی واضح ہے۔ کتاب کے صفحات اور قارئین کرام کے وقت کی کمی کے پیش نظر ہم یہاں لوگوں پر امیر المؤمنین کی پیشوائی و ولایت کے سلسلے میں نقل ہوئے دلائل کی ایک بڑی تعداد میں سے حسب ذیل کا انتخاب کرتے ہیں:

۱۔ حدیث منزلت

شام کی طرف سے آنے والے تاجروں کے ایک قافلہ نے حجاز میں داخل ہونے کے بعد پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو یہ خبر دی کہ روم کی فوج مدینہ پر حملہ کرنے کی تیاری کر رہی ہے کسی

حادثہ کے بارے میں حفظ، ماتقدم اس کے مقابلے سے بہتر ہے۔ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف سے مدینہ منورہ اور اس کے اطراف میں فوجی آمادگی کا اعلان ہوا۔ مدینہ منورہ میں سخت گرمی کا عالم تھا، پھل پکنے اور فصل کاٹنے کا موسم تھا، اس کے باوجود تیس ہزار شمشیر زن اسلام کی چھاؤنی میں جمع ہو گئے اور اس عظیم جہاد میں شرکت پر آمادگی کا اعلان کیا۔

چند مخبروں نے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو یہ خبر دی کہ مدینہ کے منافق منصوبہ بندی کر رہے ہیں کہ آپؐ کی عدم موجودگی میں مدینہ میں بغاوت کر کے خون کی ہولی کھیلیں گے۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ہر قسم کے حادثہ کی روک تھام کے لئے حضرت علیؑ کو اپنا جانشین مقرر فرما کر انھیں حکم دیا کہ آپؐ مدینہ میں ہی رہیں اور میری واپسی تک حالات پر نظر رکھیں اور لوگوں کے دینی و دنیاوی مسائل کو حل کریں۔

جب منافقین حضرت علیؑ علیہ السلام کے مدینہ میں رہنے کی خبر سے آگاہ ہوئے، تو انھیں اپنی سازشیں ناکام ہوتی نظر آئیں۔ وہ کسی اور تدبیر میں لگ گئے وہ چاہتے تھے کہ کوئی ایسا کام کریں جس سے حضرت علیؑ علیہ السلام مدینہ سے باہر چلے جائیں۔ لہذا انہوں نے یہ افواہ پھیلا دی کہ حضرت علیؑ اور پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے درمیان رنجش پیدا ہو گئی ہے اسی لئے پیغمبر نے علیؑ کے ساتھ یہ سلوک کیا ہے کہ انھیں اس اسلامی جہاد میں شرکت کرنے کی اجازت نہیں دی!

مدینہ میں حضرت علیؑ کے بارے میں — جو روز پیدا آتش سے ہی پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مہر و محبت کے سائے میں پلے بڑھے — اس قسم کی افواہ کا پھیلنا، حضرت علیؑ اور آپؐ کے دوستوں کیلئے شدید تکلیف کا سبب بنا۔ لہذا حضرت علیؑ اس افواہ کی تردید کیلئے مدینہ سے باہر نکلے اور پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں پہنچے، جو ابھی مدینہ منورہ سے چند میل کی دوری پر تھے آپؐ نے پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اس واقعہ سے آگاہ فرمایا۔ یہاں پر پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت علیؑ علیہ السلام کے تئیں اپنے بے پایاں جذبات اور محبت کا اظہار کرتے ہوئے

آپؑ کے مقام و منزلت کو درج ذیل تاریخی جملہ میں بیان فرمایا:

”اما ترضی ان تکون منی بمنزلة هارون من موسى ، ألا انه لا نبی

بعدی، انه لا ینبغی ان اذهب الا وانت خلیفتی“

”یعنی کیا تم اس پر راضی نہیں ہو کہ تمہیں مجھ سے وہی نسبت ہے جیسی ہارون کو موسیٰ سے

تھی، بس فرق یہ ہے کہ میرے بعد کوئی پیغمبر نہیں ہوگا؟ میرے اس دنیا سے جانے کے

بعد تم ہی میرے جانشین اور خلیفہ ہو گے“

یہ حدیث جو اسلامی محدثین کی اصطلاح میں حدیث ”منزلت“ کے نام سے مشہور ہے متواتر

اور قطعی احادیث میں سے ہے۔

مرحوم محدث بحرانی نے کتاب ”غایۃ المرام“ میں ان افراد کا نام ذکر کیا ہے، جنہوں نے اس

حدیث کو اپنی کتابوں میں نقل کیا ہے اور ایک دقیق و صحیح تحقیق سے ثابت کیا ہے کہ اسلامی محدثین نے

اس حدیث کو ۱۵۰ طریقوں سے نقل کیا ہے جن میں ۱۰۰ طریقے اہل سنت علماء و محدثین تک منتہی

ہوتے ہیں!

مرحوم شرف الدین عاملی نے بھی کتاب ”المراجعات“ میں اس حدیث کے اسناد کو اہل سنت

محدثین کی کتابوں سے نقل کیا ہے اور ثابت کیا ہے کہ یہ حدیث ان کی دس حدیث اور رجال کی

کتابوں میں نقل ہوئی ہے“^۱

اس حدیث کے صحیح ہونے کے لئے اتنا ہی کافی ہے کہ اہل سنت کے صحاح لکھنے والوں

”بخاری“ اور ”مسلم“ نے بھی اسے اپنی صحاح میں ذکر کیا ہے۔^۲ اس حدیث کے محکم ہونے کے

۱۔ غایۃ المرام ص ۱۰۷۔ ۱۵۴۔

۲۔ المرجعات، ص ۱۳۱۔ ۱۳۲۔

۳۔ صحیح بخاری ج ۳، ص ۵۸، صحیح مسلم ج ۲ ص ۳۲۳۔

بارے میں یہی کافی ہے کہ امیر المؤمنین کے دشمن ”سعد و قاص“ نے اسے حضرت علی علیہ السلام کی زندگی کی تین نمایاں فضیلتوں میں سے ایک فضیلت شمار کیا ہے۔

جب معاویہ اپنے بیٹے ”یزید“ کے حق میں بیعت لینے کیلئے مکہ میں داخل ہوا، اور ”الندوة“ کے مقام پر ایک انجمن تشکیل دی جس میں اصحاب رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں سے بعض شخصیتیں جمع ہوئیں۔ معاویہ نے اپنی تقریر کا آغاز ہی حضرت علی کو برا بھلا کہنے سے کیا، اسے امید تھی، کہ ”سعد و قاص“ بھی اس کی ہاں میں ہاں ملائے گا۔ لیکن سعد نے معاویہ کی طرف رخ کر کے کہا: جب بھی مجھے حضرت علی علیہ السلام کی زندگی کے تین درخشان کارنامے یاد آتے ہیں تو صدق دل سے کہتا ہوں کہ کاش! ان تین فضیلتوں کا مالک میں ہوتا! اور یہ تین فضیلتیں حسب ذیل ہیں:

۱۔ جس دن پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے علی علیہ السلام سے کہا:

”تمہیں مجھ سے وہ نسبت ہے جو ہاون کو مویٹا سے تھی، بجز اس کے کہ میرے بعد کوئی پیغمبر نہیں ہوگا“

۲۔ (پیغمبر اکرم نے) جنگ خیبر کے دوران ایک دن فرمایا:

”کل میں علم ایسے شخص کے ہاتھ میں دوں گا جسے خدا اور رسول دوست رکھتے ہیں اور وہ فاتح خیبر ہے۔ فرار کرنے والا نہیں ہے“ (اس کے بعد آنحضرت نے علم علی کے ہاتھ میں دیا)۔

۳۔ ”نجران“ کے عیسائیوں کے ساتھ مباہلہ کے دن پیغمبر اکرم نے علی، فاطمہ، حسن، و حسین

کو اپنے گرد جمع کیا اور فرمایا:

”پروردگار! یہ میرے اہل بیت ہیں“

لہذا پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے اس حدیث کے بیان کے بارے میں کسی قسم کا شک و شبہ نہیں کرنا چاہئے، بلکہ ایک قدم آگے بڑھ کر اس حدیث کی دلالت، مفہوم اور مقصد کے بارے میں قدرے غور کرنا چاہئے۔

پہلے مرحلہ میں جملہ ”الا انہ لا نبی بعدی“ قابل غور ہے کہ اصطلاح میں اسے ”جملہ استثنائی“ کہا جاتا ہے، معمولاً جب کسی کی شخصیت کو کسی دوسرے شخص کے ساتھ تشبیہ دیتے ہیں اور کہا جاتا ہے کہ یہ دونوں مقام و منزلت میں ہم پلہ ہیں، تو اہل زبان اس جملہ سے اس کے سوا کچھ اور نہیں سمجھتے ہیں کہ یہ دو افراد اجتماعی شأن و منصب کے لحاظ سے آپس میں برابر ہیں۔ اگر ایسی تشبیہ کے بعد کسی منصب و مقام کو استثناء، قرار دیا جائے تو وہ اس امر کی دلیل ہوتا ہے کہ یہ دو افراد اس استثناء شدہ منصب کے علاوہ ہر لحاظ سے ایک دوسرے کے ہم رتبہ ہیں۔

اس حدیث میں پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی ذات سے حضرت علی علیہ السلام کی نسبت کو حضرت ہارون کو، حضرت موسیٰ سے نسبت کے مانند بیان فرمایا ہے، اور صرف ایک منصب کو استثناء قرار دیا ہے، وہ یہ ہے کہ حضرت ہارون پیغمبر تھے لیکن پیغمبر اسلام چونکہ خاتم النبیین ہیں لہذا آپ کے بعد کوئی پیغمبر نہیں ہوگا۔ اور علیؑ پیغمبری کے مقام پر فائز نہیں ہوں گے۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ قرآن مجید کے حکم کے مطابق حضرت ہارون کے پاس وہ کون سے منصب تھے کہ حضرت علیؑ (بجز نبوت کے کہ خود پیغمبر نے اس حدیث کے ضمن میں اسے استثناء قرار دیا ہے) ان کے مالک تھے۔

قرآن مجید کے مطالعہ سے ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ حضرت موسیٰ نے خدائے تعالیٰ سے حضرت ہارون کیلئے راج ذیل منصب چاہے تھے اور خدا نے حضرت موسیٰ کی درخواست منظور فرما کر وہ تمام منصب حضرت ہارون کو عطا فرمائے تھے:

۱۔ وزارت کا عہدہ: حضرت موسیٰ بن عمران نے خدائے تعالیٰ سے درخواست کی کہ

حضرت ہارون کو ان کا وزیر قرار دے:

﴿وَجَعَلْ لِي وَزِيرًا مِنْ أَهْلِي ، هَارُونَ أَخِي﴾

”پروردگارا! میرے اہل بیت میں سے میرے بھائی ہارون کو میرا وزیر قرار دیدے“

۲- تقویت و تائید: حضرت موسیٰ نے خدا سے درخواست کی کہ ان کے بھائی حضرت

ہارون کے ذریعہ ان کی تائید و تقویت فرمائے:

﴿أَشِدُّ بِهِ أَمْرِي﴾

اس سے میری پشت کو مضبوط کر دے

۳- رسالت کا عہدہ: حضرت موسیٰ بن عمران نے خدائے تعالیٰ سے درخواست کی کہ

حضرت ہارون کو امر رسالت میں ان کا شریک قرار دے:

﴿وَ أَشْرِكُهُ فِي أَمْرِي﴾

اسے امر رسالت میں میرا شریک قرار دیدے۔

قرآن مجید اشارہ فرماتا ہے کہ خدائے تعالیٰ نے حضرت موسیٰ کی تمام درخواستوں کا مثبت جواب

دیکر یہ تمام عہدے حضرت ہارون کو عطا کئے:

﴿قَدْ أَوْتَيْتَ سُلُوكَ يَمْوَسَىٰ﴾

یعنی اے موسیٰ! بیشک تمہارے تمام مطالبات تمہیں عطا کر دیے گئے

۱- ۲۹/۱-۲۰

۲- ۳۱/۱

۳- ۳۲/۱

۳- ۳۶/۱ اس کے علاوہ قرآن مجید ایک دوسری آیت میں حضرت ہارون کی نبوت کے بارے میں صراحت سے فرماتا ہے:

﴿وَوَهَبْنَا لَهُ مِنْ رَحْمَتِنَا أَنْعَاءَ هَارُونَ هَارُونَ نَبِيًّا﴾ (مریم/۵۳)

اس کے علاوہ حضرت موسیٰؑ نے اپنی نیت کے دوران بنی اسرائیل میں حضرت ہارونؑ کو اپنا جانشین مقرر کرتے ہوئے فرمایا:

﴿وَقَالَ مُوسَىٰ لِأَخِيهِ هَارُونَ اخْلُفْنِي فِي قَوْمِي﴾

یعنی، موسیٰ نے ہارون سے کہا: تم قوم میں میرے خلیفہ و جانشین ہو۔

مذکورہ آیات کا مطالعہ کرنے پر ہارونؑ کے منصب اور عہدے بخوبی معلوم ہوتے ہیں اور حدیث منزلت کی رو سے مقام نبوت کے علاوہ یہ سب منصب اور عہدے حضرت علیؑ علیہ السلام کیلئے ثابت ہونے چاہئیں۔

اس صورت میں حضرت علیؑ، امام، وزیر، ناصر و مددگار اور رسول خدا کے خلیفہ تھے اور پیغمبر کی عدم موجودگی میں لوگوں کی رہبری و قیادت کے عہدہ دار تھے۔

ایک سوال کا جواب:

ممکن ہے یہ کہا جائے کہ حضرت علیؑ علیہ السلام کیلئے پیغمبر اکرمؐ کی جانشینی انہیں ایام سے مخصوص تھی جب آپؐ مدینہ سے باہر تشریف لے گئے تھے۔ اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ حضرت علیؑ پیغمبر اسلامؐ کی رحلت کے بعد آپؐ کے مطلق خلیفہ اور جانشین تھے۔

لیکن پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زندگی کا ایک سرسری مطالعہ کرنے سے اس سوال کا جواب واضح ہو جاتا ہے۔

۱۔ اعراف/۱۳۲۔ ایک اور آیت میں حضرت ہارونؑ کی وزارت کے بارے میں صراحت سے فرماتا ہے:

﴿وَجَعَلْنَا مَعَهُ أَخَاهُ هَارُونَ وَزِيرًا﴾

ہم نے موسیٰ کے بھائی ہارونؑ کو ان کا وزیر قرار دیا“ (فرقان/۳۵)

ایک: حضرت علی علیہ السلام پہلے اور آخری شخص نہیں تھے۔ جنہیں پیغمبر اکرمؐ نے اپنی عدم موجودگی میں مدینہ میں اپنا جانشین قرار دیا ہو۔ بلکہ پیغمبر اکرمؐ مدینہ منورہ میں اپنے دس سالہ قیام کے دوران، جب کبھی مدینہ سے باہر تشریف لے جاتے تھے تو کسی نہ کسی شخص کو اپنی جگہ پر جانشین مقرر کر کے ذمہ داریاں اسے سونپتے تھے اگر پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اس جملہ کے ذریعہ امام کو ہارون سے تشبیہ دینے کا مقصد صرف آپ کے مدینہ میں عدم موجودگی کے دوران امام کی جانشینی تھا، تو پیغمبر اسلامؐ نے یہ جملہ اپنے دیگر جانشینوں کیلئے کیوں نہیں فرمایا، جبکہ وہ لوگ بھی جب پیغمبرؐ جہاد یا حج خانہ خدا کیلئے مدینہ سے باہر تشریف لے جاتے، آپ کے جانشین ہوا کرتے تھے؟ پھر اس فرق کا سبب کیا تھا؟

دو: ایک مختصر مدت کیلئے حضرت علی علیہ السلام کو اپنا جانشین مقرر کرنے کی صورت میں پیغمبرؐ کو اس طرح تفصیلی جملہ بیان کر کے منصب رسالت کو اس سے مستثنیٰ قرار دینے کی ضرورت ہی نہیں تھی!

اس کے علاوہ اس قسم کی جانشینی کسی خاص فخر کا سبب نہ ہوتی اور اگر فرض کر لیں کہ یہ ایک اعزاز تھا تو اس صورت میں یہ چیز حضرت علیؑ کے خاص فضائل میں شمار نہیں ہوتی کہ برسوں کے بعد سعد و قاص اس فضیلت کو سیکڑوں سرخ اونٹوں کے عوض خریدنے کی تمنا کرتا! اور خود حضرت علیؑ کے انتہائی اہم فضائل (فاتح خیبر اور نجران کے عیسائیوں کے ساتھ مہابہ میں نفس پیغمبرؐ اور آپ کے اہل بیت) کے مقام تک پہنچنے کی آرزو کرتا!!

تین: اگر پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے صرف جنگ تبوک کیلئے جانے کے موقع پر اس تاریخی جملہ کو بیان فرمایا ہوتا تو کسی کے ذہن میں ایسا سوال پیدا ہونا بجا تھا۔ لیکن پیغمبر اسلامؐ نے امام علی علیہ السلام کے بارے میں یہ اہم جملہ دیگر مواقع پر بھی فرمایا ہے اور تاریخ اور حدیث کے

صفحات میں یہ واقعات مثبت و ضبط ہو چکے ہیں۔ ہم یہاں پر اس کے صرف دو نمونوں کی طرف اشارہ کرتے ہیں!

۱۔ ایک دن حضرت ابو بکر، عمر اور ابو عبیدہ بن جراح پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر تھے۔ پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے دست مبارک کو حضرت علیؑ کے شانہ پر رکھ کر فرمایا:

”یا علی انت اول المؤمنین ایماناً و اولہم اسلاماً، و انت منی بمنزلۃ ہارون من موسیٰ“^۱

”اے علی! تم وہ پہلے شخص ہو جو مجھ پر ایمان لائے اور دین اسلام کو قبول کیا اور تم کو مجھ سے وہی نسبت ہے جو ہارون کو موسیٰ سے تھی“

۲۔ ہجرت کے ابتدائی ایام میں پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مہاجرین و انصار کو جمع کیا اور انہیں آپس میں ایک دوسرے کا بھائی بنایا صرف حضرت علیؑ کے ساتھ کسی کا بھائی قرار نہ دیا۔ حضرت علیؑ کی آنکھوں میں آنسو آ گئے، آپؐ نے پیغمبرؐ سے عرض کی: یا رسول اللہ! کیا مجھ سے کوئی غلطی سرزد ہوئی ہے کہ آپؐ نے ہر فرد کیلئے ایک بھائی معین فرمایا، اور میرے لئے کسی کا انتخاب نہیں کیا؟ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہاں پر صحابیوں کے مجمع میں اپنا وہی تاریخی جملہ دہرایا:

”وَ الَّذِیْ بَعَثَنِیْ بِالْحَقِّ مَا اخْرَجْتَکَ الْاِلْفِیْ وَ اَنْتَ مِنْنِیْ بِمَنْزِلَةِ

ہارون من موسیٰ غیر انه لا نبیٰ بعدی و انت اخی و وارثی“^۲

۱۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس جملہ کو مختلف مواقع پر سات بار بیان فرمایا ہے، لیکن ہم اختصار کی وجہ سے یہاں پر صرف دو مورد کا ذکر کرتے ہیں۔

”قسم اس خدا کی جس نے مجھے حق پر مبعوث فرمایا ہے، میں نے تمہیں صرف اپنا بھائی بنانے کے لیے یہ تاخیر کی ہے، اور تم کو مجھ سے وہی نسبت ہے جو ہارون کو موسیٰ سے تھی، بجز اس کے کہ میرے بعد کوئی پیغمبر نہیں ہوگا، تم میرے بھائی اور میرے وارث ہو“^۱

حضرت علیؑ ان تمام عہدوں اور منصبوں کے مالک تھے جو حضرت ہارون کو ملے تھے اس بات کی ایک اور دلیل یہ ہے کہ پیغمبر اسلام خدا کے حکم سے مختلف طریقوں سے کوشش فرماتے تھے کہ لوگ اس سے آگاہ ہو جائیں کہ حضرت علیؑ کی حیثیت آپ کی نسبت وہی ہے جو ہارون کی موسیٰ کی نسبت تھی اور نبوت کے علاوہ اس میں کسی اور قسم کی کمی نہیں ہے۔

لہذا جب حضرت زہرا علیہا السلام سے حضرت علیؑ علیہ السلام کے دو بیٹے پیدا ہوئے، تو پیغمبرؐ نے علیؑ کو حکم دیا کہ ان کے نام ”حسن“ و ”حسین“ رکھیں جیسا کہ ہارون کے بیٹوں کے نام ”شبر و شمیر“ تھے کہ عربی زبان میں ان کا مطلب حسن و حسین ہوتا ہے۔

ان دو جانشینوں (یعنی حضرت علیؑ اور حضرت ہارون) کے بارے میں تحقیق و جستجو سے چند دیگر مشابہتوں کا سراغ بھی ملتا ہے ہم یہاں پر ان کے ذکر سے صرف نظر کرتے ہیں، مرحوم شرف الدین نے کتاب ”المراجعات“ میں اس سلسلے میں مفصل بحث کی ہے۔^۲

۱۔ منتخب کنز العمال (مسند کے ماشیہ میں) ج ۵ ص ۳۱

۲۔ المرجعات، ص ۱۴۱، ۱۴۲

اٹھارہویں فصل

حدیث غدیر

(پہلا حصہ)

اسلام کی عالمی تحریک، ابتداء سے ہی قریش بلکہ جزیرہ نمائے عرب کے عام بت پرستوں کی طرف سے جنگ اور مخالفتوں سے رو برو ہوئی۔ جو گونا گوں سازشوں کے ذریعہ اس شیع الہی کو بھانے کے درپے تھے، لیکن تمام تر کوششوں کے باوجود کوئی خاص کامیابی حاصل نہ کر سکے۔ ان کی آخری خیالی امید یہ تھی کہ اس عظیم تحریک کے پائے اس کے پیشوا اور بانی کی وفات کے بعد اس طرح ڈھب جائیں گے جس طرح پیغمبرؐ سے پہلے بعض لوگوں کی یکتا پرستی کی دعوت نے ان کی وفات کے بعد خاموش ہو گئی۔

قرآن مجید جس نے اپنی بہت سی آیات میں ان کی سازشوں اور منصوبوں سے پردہ اٹھایا تھا اس دفعہ بت پرستوں کی آخری خیالی امید یعنی وفات پیغمبرؐ کے بارے میں درج ذیل آیت میں اشارہ فرماتا ہے:

﴿أَمْ يَقُولُونَ شَاعِرٌ نَّتَرَبَّصُ بِهِ رَيْبَ الْمُنُونِ ﴿۱﴾ قُلْ تَرَبَّصُوا فَإِنِّي مَعَكُمْ مِنَ الْمُتَرَبِّصِينَ ﴿۲﴾ أَمْ تَأْمُرُهُمْ أَخْلَامُهُمْ بِهَذَا أَمْ هُمْ قَوْمٌ طَاعُونَ ﴿۳﴾﴾

”یا یہ لوگ یہ کہتے ہیں کہ پیغمبر شاعر ہے اور ہم اس کی موت کا انتظار کر رہے ہیں۔ تو آپ

۱۔ جیسے، درقہ بن نوفل جس نے بیسالی کتابوں کے مطالعہ کے بعد بت پرستی کو چھوڑ کر عیسائی مذہب قبول کر لیا تھا۔

کہہ دیجئے کہ بیشک تم انتظار کرو میں بھی تمہارے ساتھ انتظار کرنے والوں میں ہوں! کیا ان کی خام عقلیں انہیں اس بات پر آمادہ کرتی ہیں یا وہ واقعاً سرکش قوم ہیں“

مناسب ہے کہ یہاں پر بت پرستوں کی طرف سے رسالتماب کے ساتھ چھیڑی گئی بعض خانانہ جنگوں اور روڈے اٹکانے کی منحوس حرکتوں کی ایک فہرست بیان کی جائے اور اس کے بعد دیکھا جائے کہ خدائے تعالیٰ نے ان کی آخری امیدوں کو کیسے ناکام بنایا اور آغوش پیغمبر میں حضرت علیؑ جیسے لائق و شائستہ شخص کو پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے جانشین کی حیثیت سے منتخب کر کے ان کی سازشوں کو خاک میں ملا دیا۔

۱۔ تہمت کا حربہ

کفار مکہ نے پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر شاعر، کاہن، دیوانہ اور جادوگر ہونے کی تہمتیں لگا کر یہ کوشش کی کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ارشادات کے اثرات کم کریں، لیکن سماج کے مختلف طبقوں میں اسلام کی نمایاں ترقی نے ثابت کر دیا کہ آپ کی مقدس ذات ان تہمتوں سے بالاتر تھی۔

۲۔ آپ کے پیروؤں کو آزار پہنچانا

کفار مکہ کا ایک اور منصوبہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پیروؤں کو آزار پہنچانا اور انہیں جسمانی اذیتیں دینا اور قتل کرنا تھا تا کہ آپ کے ارشادات و ہدایت کے وسیع اثرات کو روک سکیں۔ لیکن پیغمبر کے حامیوں کی ہر ظلم و جبر اور اذیت و آزار کے مقابلے میں استقامت و پامردی نے قریش کے سرداروں کو اپنے منحوس مقاصد تک پہنچنے میں ناکام بنا دیا۔ آنحضرت کے حامیوں کی آپ کے تئیں والہانہ عقیدت و اخلاص نے دشمنوں کو حیرت زدہ کر دیا، حتیٰ ابوسفیان کہتا تھا، ”میں نے قیصر و کسریٰ کو دیکھا ہے لیکن ان میں سے کسی کو اپنے پیروؤں کے درمیان محمد صلی اللہ علیہ وآلہ

وسلم جیسا با عظمت نہیں دیکھا جن کے پیروؤں نے ان کے مقاصد کی راہ میں اس قدر جاں بازی اور فداکاری کا ثبوت دیا ہے!

۳۔ عرب کے بڑے داستان گو کو دعوت

قرآن مجید کے روحانی اور جذباتی اثرات سے کفار قریش حیرت زدہ تھے اور تصور کرتے تھے کہ قرآن مجید کی آیات کو سننے کیلئے لوگوں کا پروانہ وار دوڑنا اس سبب سے ہے کہ قرآن مجید میں گذشتہ اقوام کی داستانیں اور کہانیاں بیان ہوئی ہیں۔ اس لئے کفار مکہ نے دنیائے عرب کے سب سے مشہور داستان گو "نصر بن حارث" کو دعوت دی کہ وہ خاص موقعوں پر مکہ کی گلی کوچوں میں 'ایران' اور "عراق" کے بادشاہوں کے قصے سنائے تاکہ اس طرح لوگوں کو رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف مائل ہونے سے روک سکیں! یہ منصوبہ اس قدر احمقانہ تھا کہ خود قریش یہ داستانیں سننے سے تنگ آچکے تھے اور اس سے دور بھاگتے تھے۔

۴۔ قرآن مجید سننے پر پابندی

قریش کا ایک اور منصوبہ قرآن مجید سننے پر پابندی عائد کرنا تھا اس شیع الہی کے پروانوں کی استقامت سے ان کا یہ منصوبہ بھی خاک میں مل گیا۔ قرآن مجید کی زبردست شیرینی اور دلکشی نے مکہ کے لوگوں کو اس قدر فریفتہ بنا دیا تھا کہ وہ رات کے اندھیرے میں گھروں سے نکل کر پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے گھر کے اطراف میں چھپ جاتے تھے تاکہ جب پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نماز شب اور تلاوت قرآن مجید کیلئے اٹھیں تو وہ قرآن کی تلاوت سن سکیں۔ قریش کے کفار صرف لوگوں کو قرآن سننے سے ہی منع نہیں کرتے تھے بلکہ لوگوں کو پیغمبر سے ملنے جلنے سے منع کرتے تھے۔ جب عرب کی بعض بزرگ شخصیتیں جیسے، اشی و طفیل بن عمر پیغمبر سے ملنے کیلئے مکہ میں

آئے تو قریش نے مختلف ذرائع سے ان کو پیغمبر تک پہنچنے سے روک دیا۔

۵۔ اقتصادی پابندی

کفار قریش نے ایک دستور کے ذریعہ لوگوں میں یہ اعلان کیا کہ کسی کو بنی ہاشم یا محمدؐ کے طرفداروں کے ساتھ لین دین کرنے کا حق نہیں ہے۔ جس کی بنا پر پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنے ساتھیوں اور اعزہ کے ساتھ ”شعب ابی طالب“ میں پورے تین سال تک انتہائی سخت اور قابل رحم زندگی گزارنے پر مجبور ہوئے۔ لیکن قریش کے بعض سرداروں کے اقدام اور بعض معجزات کے رونما ہونے کی وجہ سے یہ بائیکاٹ ختم ہو گیا۔

۶۔ پیغمبر اکرمؐ کو قتل کرنے کی سازش

قریش کے سرداروں نے یہ فیصلہ کیا کہ مختلف قبیلوں سے تعلق رکھنے والے قریش کے چالیس جوان رات کے اندھیرے میں پیغمبرؐ کے گھر پر حملہ آور ہوں اور آپؐ کو آپ کے بسترہ پر ہی نکلڑے نکلڑے کر ڈالیں۔ لیکن خداوند کریم (جو ہر وقت آپ کا حافظ و نگہبان تھا) نے پیغمبرؐ کو دشمنوں کی اس سازش سے آگاہ کر دیا اور پیغمبرؐ نے خدا کے حکم سے حضرت علیؑ کو اپنے بسترہ پر سلا کر خود مکہ سے مدینہ کی طرف ہجرت کی۔ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مدینہ کی طرف ہجرت اور اس و خزرج جیسے قبیلوں کا اسلام کی طرف مائل ہونا اس کا باعث ہوا کہ مسلمانوں کو ایک امن کی جگہ مل گئی اور پراکندہ مسلمان ایک پر امن جگہ پر جمع ہو کر دین کا دفاع کرنے کے لائق ہو گئے۔

۷۔ خونین جنگیں

مسلمانوں کے مدینہ منورہ میں اکٹھا ہونے اور حکومت اسلامی کی تشکیل کو دیکھتے ہوئے جزیرہ نمائے عرب کے بت پرست خوفزدہ ہو گئے اور اس دفعہ یہ فیصلہ کیا کہ ہدایت کی شمع فروزاں کو جنگ اور قتل

وغارت کے ذریعہ ہمیشہ کیلئے بچھا دیں۔ اسی غرض سے کفار نے مسلمانوں سے بدر، احد، خندق اور حنین کی خونین جنگیں لڑیں۔ لیکن خدا کے فضل و کرم سے یہ جنگیں مسلمانوں کی فوجی طاقت میں اضافہ کا باعث بنیں اور انہوں نے بت پرستوں کو عرب میں ذلیل و خوار کر کے رکھ دیا۔

۸۔ پیغمبر اسلامؐ کی وفات

دشمنوں نے اپنے ناپاک عزائم کے سلسلے میں آخری امید پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رحلت سے باندھی تھی۔ وہ سوچ رہے تھے کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وفات کے ساتھ ہی اس تحریک کی بنیادیں اکھڑ جائیں گی اور اسلام کا بلند پایہ محل زمین بوس ہو جائے گا۔ اس مشکل کو دور کرنے اور اس سازش کو ناکام بنانے کیلئے دو راستے موجود تھے:

۱۔ امت اسلامیہ کی فکری و عقلی نشوونما اس حد تک پہنچ جائے کہ مسلمان پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وفات کے بعد اسلام کی اس نئی تحریک کی عہد رسالت کے مانند ہدایت و رہبری کر سکیں اور اسے ہر قسم کے انحراف سے بچاتے ہوئے ”صراطِ مستقیم“ پر آگے بڑھائیں۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رحلت کے بعد امت کی ہمد جہت قیادت کی سخت ضرورت تھی کیونکہ ابھی جو بد قسمتی سے امت کے افراد میں سازگار حالات نہیں پائے جاتے تھے۔ اس وقت یہ مناسب نہیں ہے کہ ان حالات کے ہونے یا نہ ہونے پر مفصل بحث کریں، لیکن مختصر طور درج ذیل چند اہم نکات کی طرف اشارہ کیا جاتا ہے:

الف) ایک ملت کی مختلف میدانوں میں ترقی اور بنیادی انقلاب کا پیدا ہونا چند روز یا چند سالوں میں ممکن نہیں ہوتا اور مختصر مدت میں ایسے مقاصد تک نہیں پہنچا جاسکتا ہے بلکہ انقلاب کی بنیادوں کو استحکام بخشنے اور اسے لوگوں کے دلوں کی گہرائیوں میں اتارنے کیلئے ایسے ممتاز اور غیر معمولی فرد یا افراد کی ضرورت ہوتی ہے جو اس تحریک کے بانی کی رحلت کے بعد امور کی باگ ڈور سنبھال سکیں اور انتہائی ہوشیاری اور بہیم تبلیغ کے ذریعہ سماج کو ہر قسم کے غلط رجحانات سے بچا سکیں تا

کہ پرانی نسل کی جگہ ایک ایسی نئی نسل لے لے جو ابتداء سے ہی اسلامی آداب و اخلاق کے ماحول میں پلی ہو۔ ورنہ دوسری صورت میں تحریک کے بانی کی وفات کے ساتھ ہی بہت سے لوگ اپنی پرانی روش کی طرف پلٹ جائیں گے۔

اس کے علاوہ تمام الہی تحریکوں میں اسلام ایسی خصوصیت کا حامل تھا جس میں اس تحریک کے استحکام کیلئے ممتاز افراد کی اشد ضرورت تھی۔ دین اسلام ایسے لوگوں کے درمیان وجود میں آیا تھا جو دنیا کی پسماندہ ترین قوم شمار ہوتے تھے اور اس معاشرہ کے لوگ سماجی و اخلاقی قواعد و ضوابط کے لحاظ سے انتہائی محرومیت کی حالت میں زندگی بسر کرتے تھے مذہبی آداب و رسوم کے طور پر وہ اپنے آباء و اجداد سے وراثت میں ملی ہوئی (جو خرافات اور برائیوں سے بھری تھیں) کے علاوہ کوئی اور چیز نہیں جانتے تھے۔ حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰ کے دین نے ان کی سر زمین پر کوئی اثر نہیں ڈالا تھا اور حجاز کے اکثر لوگ اس سے محروم تھے اور اس کے مقابلہ میں جاہلیت کے عقائد اور رسم و رواج ان کے دلوں میں راسخ ہو کر ان کی روح میں آمیختہ ہو چکے تھے۔

ممکن ہے کہ ایسے معاشروں میں مذہبی اصلاح زیادہ مشکل نہ ہو لیکن اس کا تحفظ اور اس کی بقاء ایسے لوگوں میں جن کی روح میں منفی عوامل نفوذ کر چکے ہوں، انتہائی مشکل کام ہوتا ہے اس کیلئے مسلسل ہوشیاری اور تدبیر کی ضرورت ہوتی ہے تاکہ ہر قسم کے انحرافات اور رجعت پسندی کو روکا جاسکے۔

”احد“ اور ”حنین“ کے دل دوز حوادث کے مناظر، جب گرما گرم جنگ کے دوران تحریک کے حامی رسالتناہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو میدان کارزار میں تنہا چھوڑ کر باگ کھڑے ہوئے تھے اس بات کے واضح گواہ ہیں کہ تحریک کے مؤمن افراد، جو اس کی راہ میں جان و مال کی قربانی دینے پر حاضر تھے، بہت کم تھے اور معاشرے کے زیادہ تر لوگ فکری و عقلی رشد و بلوغ کے لحاظ سے اس مقام پر نہیں پہنچے تھے کہ پیغمبر اسلام نظام کی باگ ڈوران کے ہاتھ میں دیدیتے اور دشمن کی آخری امید یعنی

پیغمبرؐ کی رحلت کے انتظار، کو ناکام بنا دیتے۔

یہ وہی امت ہے جو پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رحلت کے بعد اختلاف و تفرقہ کا مرکز بن گئی اور رفتہ رفتہ ۷۲ فرقوں میں بٹ گئی۔

جو باتیں ہم نے اوپر بیان کیں اس سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ پیغمبرؐ کی رحلت کے وقت فکری اور عقلی رشد کے لحاظ سے امت اسلامیہ اس حد تک نہیں پہنچی تھی کہ دشمنوں کے منصوبے ناکام ہو جاتے اسلئے کسی دوسری چارہ جوئی کی ضرورت تھی کہ ہم ذیل میں اس کی طرف اشارہ کرتے ہیں:

۲- تحریک کو استحکام بخشنے کیلئے آسان اور سادہ طریقہ یہ ہے کہ تحریک کے اصول و فروع پر ایمان و اعتقاد کے لحاظ سے پیغمبرؐ جیسا ایک لائق و شائستہ شخص تحریک کی قیادت و رہبری کیلئے خدائے تعالیٰ کی طرف سے انتخاب کیا جائے اور وہ قوی ایمان، وسیع علم اور عصمت کے سائے میں انقلاب کی قیادت کو سنبھال کر اس کو استحکام اور تحفظ بخشنے۔

یہ وہی مطلب ہے جس کے صحیح اور مستحکم ہونے کا دعویٰ شیعہ مکتب فکر کرتا ہے۔ اس سلسلے میں بہت سے تاریخی شواہد بھی موجود ہیں کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حجۃ الوداع سے واپسی کے دوران ۱۸ ذی الحجۃ کو خدا کے حکم سے اس گتھی کو سلجھا دیا اور خدا کی طرف سے اپنا جانشین اور ولی مقرر فرما کر اپنی رحلت کے بعد اسلام کو استحکام اور تحفظ بخشا۔ اس کا واقعہ یوں ہے، کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ۱۰ھ میں حج بجالانے کیلئے مکہ کی طرف عزمیت فرمائی، چونکہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حج کا یہ سفر آپ کی زندگی کا آخری سفر تھا اس لئے یہ حجۃ الوداع کے نام سے مشہور ہوا۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ شوق سے یا احکام حج کو پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے سیکھنے کیلئے جن لوگوں نے اس سفر میں آپ کا ساتھ دیا ان کی تعداد کے بارے میں مؤرخین نے ایک لاکھ بیس ہزار کا تخمینہ لگایا ہے۔

حج کی تقریبات ختم ہوئیں اور پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم راہی مدینہ ہوئے جو ق در

جوق لوگ آپ کو الوداع کر رہے تھے لیکن مکہ میں آپ سے ملحق ہونے والوں کے علاوہ سب آپ کے ہمسفر تھے۔ کاروان، جتھہ سے تین کلومیٹر کی دوری پر ”غدیر خم“ کے ایک صحرا میں پہنچا، اچانک وحی الہی نازل ہوئی اور پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو رکنے کا حکم ملا۔ پیغمبر نے بھی حکم دیا کہ سب حجاج رک جائیں تاکہ پیچھے رہنے والے لوگ بھی پہنچ جائیں۔

پیغمبر کی طرف سے ایک پتے ریگستان میں دو پہر کو تہذیب آفتاب میں رکنے کے حکم پر لوگ توجہ میں تھے۔ اور سرگوشیاں کر رہے تھے کہ ضرور خدا کی طرف سے کوئی خاص حکم پہنچا ہے اور اس کی اہمیت کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ خدا کی طرف سے پیغمبر کو امر ہوا ہے کہ وہ ان نامساعد حالات میں لوگوں کو روک کر فرمان الہی پہنچائیں۔

پیغمبر اکرمؐ کو یہ فرمان الہی درج ذیل آیہ شریفہ کے ذریعہ ملا۔

﴿يَا أَيُّهَا الرَّسُولُ بَلِّغْ مَا أُنزِلَ إِلَيْكَ مِنْ رَبِّكَ وَإِنْ لَمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَهُ وَاللَّهُ يَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ﴾ ۱

”اے پیغمبر! آپ اس حکم کو پہنچادیں جو آپ کے پروردگار کی طرف سے نازل کیا گیا ہے اور اگر آپ نے یہ نہ کیا تو گویا آپ خدا کی رسالت کو نہیں بجالائے اور خدا آپ کو لوگوں کے شر سے محفوظ رکھے گا“

اس آیہ شریفہ کے مضمون پر غور کرنے سے ہمیں مندرجہ ذیل نکات کی طرف ہدایت ملتی ہے:

اولاً: جس حکم الہی کو پہنچانے کی ذمہ داری پیغمبر اسلامؐ کو ملی تھی وہ اتنا اہم اور عظیم تھا کہ اگر پیغمبر اکرمؐ (بفرض محال) اسے پہنچانے سے ڈرتے اور نہ پہنچاتے تو گویا آپ نے اپنی رسالت کا کام ہی انجام نہیں دیا ہوتا، بلکہ (آئندہ اس کی وضاحت کریں گے کہ) اس ما موریت کو بجالانے سے ہی آپ کی رسالت مکمل ہوتی ہے۔

دوسرے الفاظ میں ﴿مَا أَنْزَلَ إِلَيْكَ﴾ (جو آپ پر نازل کیا گیا ہے) کا مقصود قرآن مجید کی تمام آیات اور احکام اسلامی نہیں ہو سکتے ہیں، کیونکہ یہ بات بالکل واضح ہے کہ اگر پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم احکام الہی نہ پہنچاتے تو اپنی رسالت کو انجام ہی نہ دیا ہوتا اور اس قسم کے بدیہی امر کے بارے میں کچھ کہنے اور آیت نازل کرنے کی ضرورت ہی نہیں تھی، بلکہ اس کا مقصد ایک خاص موضوع کو پہنچانا ہے کہ اس کا پہنچانا رسالت پہنچانے کے برابر شمار ہوتا ہے اور جب تک اسے نہ پہنچایا جائے، رسالت کی عظیم ذمہ داری اپنے کمال تک نہیں پہنچتی۔

اس بنا پر اس مأموریت کا مسئلہ اسلام کے اہم اصولوں میں سے ایک ہونا چاہئے جو اسلام کے دوسرے اصول و فروع سے پیوستہ ہو اور خدا کی وحدانیت اور پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رسالت کی طرح یہ بھی ایک اہم مسئلہ ہو۔

ثانیاً: سماجی حالات اور ان کے محاسبات کے پیش نظر پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم یہ گمان کرتے تھے کہ اس مأموریت کو انجام دینے کی صورت میں ممکن ہے لوگوں کی طرف سے آپ کو کوئی نقصان پہنچے، اس لئے خدائے تعالیٰ نے آپ کے ارادہ کو قوت بخشنے کیلئے فرمایا:

﴿وَاللَّهُ يَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ﴾

”خدا آپ کو لوگوں کے شر سے محفوظ رکھے گا“

اب یہ دیکھنا ہے کہ مفسرین اسلام نے اس آیت کے موضوع کے بارے میں جو احتمالات

۱۔ فرما دیے ہیں اپنی تفسیر (ج ۳، ص ۶۳۵) میں پیغمبر کی اس مأموریت کے بارے میں وہی احتمالات بیان کئے ہیں جب کہ ان میں سے ایک احتمال بھی — جبکہ ان کا کوئی صحیح ناخذ بھی نہیں ہے — مذکورہ دو شرائط کا حامل نہیں ہے، جنہیں ہم نے مذکورہ آیت سے اس کے موضوع کے تحت بیان کیا ہے، ان میں سے زیادہ تر احتمالات ہرگز اس قدر اہم نہیں ہیں کہ ان کے نہ پہنچانے پر رسالت کو کوئی نقصان پہنچتا یا بیخامات کا پہنچانا خوف و وحشت کا سبب بن جاتا یا یہ احتمالات حسب ذیل ہیں:

۱۔ یہ آیت، گناہگار مردوں اور عورتوں کو سنگسار کرنے کے بارے میں ہے۔

۲۔ یہ آیت، یہودیوں کے پیغمبر پر اعتراض کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔

۳۔ جب قرآن مجید نے پیغمبر کی بیویوں کو تنبیہ کی کہ اگر وہ دنیا کے دروڑ کو چاہیں گی تو پیغمبر ان کو طلاق دیدیں گے، پیغمبر

بیان کئے ہیں ان میں سے کون سا احتمال اس آیت شریفہ کے مضمون سے قریب تر ہے۔ شیعہ محدثین کے علاوہ اہل سنت محدثین کے تیسرا افراد نے لکھا ہے کہ یہ آیت شریفہ غدیر کے دن نازل ہوئی ہے، جس دن خدا نے پیغمبرؐ کو مامور کیا کہ علیؑ کو ”مؤمنین کے مولا“ کے طور پر پہنچوائیں۔

امت پر پیغمبرؐ کی جانشینی کے عنوان سے امامؑ کی قیادت کا مسئلہ ہی اتنا ہی اہم اور سنجیدہ تھا کہ اس کا پہنچانا رسالت کی تکمیل کا باعث اور نہ پہنچانا رسالت کے نقصان اور رسولؐ کی زحماتوں کے اس حکم الہی کو پہنچانے سے ڈرتے تھے کہ کہیں وہ دنیا کو ترجیح نہ دیں۔

۳۔ یہ آیت پیغمبرؐ کے منہ بولے بیٹے زید کے واقعہ سے متعلق ہے کہ پیغمبرؐ کو خدا کی طرف سے حکم ہوا کہ وہ زید کی خلاق یافتہ بیوی سے شادی کر لیں۔

۵۔ یہ آیت لوگوں اور منافقین کو جہاد کی طرف دعوت دینے سے مربوط ہے۔

۶۔ بتوں کی برائی کرنے سے پیغمبرؐ کی خاموشی سے مربوط ہے۔

۷۔ یہ آیت حینہ اوداع میں اس وقت نازل ہوئی ہے جب پیغمبرؐ ہجرت اور مناسک بیان فرما رہے تھے۔

۸۔ پیغمبرؐ قریش، یہود اور نصاریٰ سے ڈرتے تھے اس لئے یہ آیت آپؐ کے ارادے کو قوت بخشنے کیلئے نازل ہوئی ہے۔

۹۔ ایک جنگ میں جب پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ایک درخت کے سایہ میں آرام فرما رہے تھے، ایک عرب تنگی تلوار

لے کر پیغمبرؐ پر حملہ آور ہوا اور آپؐ سے مخاطب ہو کر کہا: ”اب تمہیں مجھ سے کون بچا سکتا ہے“، پیغمبرؐ نے جواب میں فرمایا: ”خدا“ اس

دقت دشمن پر خوف طاری ہوا وہ پیچھے ہٹ گیا اور اس کا سر درخت سے ٹکرا کر پھٹ گیا، اس وقت یہ آیت نازل ہوئی ﴿وَاللّٰهُ

بِعَصْمِكَ مِنَ النَّاسِ﴾ آیت شریفہ کے مفاد کو مذکورہ احتمالات کے مطابق ہونا (مثلاً آخری احتمال) بہت بعید ہے جب کہ غدیر خم

کے واقعہ کے ساتھ مطابقت رکھتا ہے۔

۱۔ مرحوم علامہ سائینی نے ان تیس افراد کے نام اور خصوصیات اپنی تالیف، الغدیر، ج ۱، ص ۱۹۶-۲۰۹ میں مفصل بیان کئے ہیں ان میں

بلطری، ابو نعیم اصبھانی، ابن عباس، ابو اسحاق موینی اور جلال الدین سیوطی وغیرہ جیسے افراد بھی شامل ہیں کہ انہوں نے ابن عباس، ابو

سعید خدری اور براء بن عازب سے یہ حدیث نقل کی ہے۔

تباہ ہو جانے کا سبب شمار ہوتا۔

اسی طرح پیغمبر اکرمؐ کا اجتماعی محاسبات کے پیش نظر خوف و تشویش سے دوچار ہونا بجا تھا، کیونکہ حضرت علیؑ جیسے صرف ۳۳ سالہ شخص کا جانشین اور وصی قرار پانا اس گروہ کیلئے انتہائی سخت اور دشوار تھا جو عمر کے لحاظ سے آپؐ سے کہیں زیادہ بڑے تھے!

اس کے علاوہ ایسے افراد بھی مسلمانوں کی صفوں میں موجود تھے جن کے اسلاف مختلف جنگوں میں حضرت علیؑ کے ہاتھوں قتل ہو چکے تھے اور قدرتی طور پر وہ کینہ تو ز ایسے شخص کی حکومت کی شدید مخالف کرتے۔

اس کے علاوہ حضرت علیؑ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پچازاد بھائی اور داماد بھی تھے، اور تنگ نظر لوگوں کی نظر میں ایسے شخص کو خلافت کے عہدہ پر مقرر کرنا اس کا سبب ہوتا کہ وہ اس عمل کو کتبہ پروری تصور کرتے۔

لیکن ان تمام ناسازگار حالات کے باوجود خدائے تعالیٰ کا حکیمانہ ارادہ یہی تھا کہ رسولؐ کا جانشین مقرر فرما کر اسلامی تحریک کو تحفظ بخشنے اور اپنے نبیؐ کی عالمی رسالت کا رہبر و راہنما مقرر کر کے اسے تکمیل تک پہنچائے۔

اب اس تاریخی واقعہ کی تفصیل ملاحظہ فرمائیں۔

۱۔ خاص طور پر عرب قوم میں ہمیشہ بڑے عہدوں کو قبیلہ کے عمر رسیدہ لوگوں کے سپرد کرنے کی رسم تھی اور جوانوں کو اس بہانے سے ایسے عہدے سونپنے کے قابل نہ تھے کہ جوان زمانہ کا تجربہ نہیں رکھتے ہیں۔ لہذا جب پیغمبرؐ نے "عتاب بن ولید" کو مکہ کا گورنر اور اسامہ کو پارسا اور مقرر فرمایا تو عمر رسیدہ لوگوں نے آپؐ پر اعتراض کیا پھر لوگ اس امر کی طرف توجہ نہیں دیتے کہ حضرت علیؑ دیگر جوانوں سے مختلف ہیں، یہ لائق اور شائستہ شخص الہی عنایتوں کے سایہ میں ایسے مقام تک پہنچا ہوا ہے کہ ہر قسم کی خطا اور لغزشوں سے محفوظ ہے اور ہمیشہ عالم بالا سے امداد حاصل کرتا ہے۔

انیسویں فصل

حدیث غدیر

(دوسرا حصہ)

غدیر کا واقعہ ایک ابدی حقیقت

۱۸ ذی الحجہ کی دوپہر کا وقت تھا، سورج کی تمازت نے غدیر خم کی سرزمین کو جھلسا رکھا تھا۔ لوگوں کی ایک بڑی تعداد— جس کے بارے میں ۷۰ ہزار سے ۱۲۰ ہزار تک لکھا گیا— پیغمبر کے حکم سے وہاں پر پڑاؤ ڈالے ہوئے تھی اور یہ لوگ اس دن رونما ہونے والے تاریخی واقعہ کا انتظار کر رہے تھے۔ گرمی کی شدت کا یہ عالم تھا کہ، لوگوں نے اپنی رداںیں تہ کر کے آدھی سر پر اور آدھی پاؤں کے نیچے رکھی تھیں۔

ان حساس لمحات میں اذان ظہر کی آواز سے تمام صحرا گونج اٹھا، اور لوگ نماز ظہر کیلئے آمادہ ہوئے، پیغمبر اکرم نے اس عظیم اور پر شکوہ اجتماع— کہ سرزمین غدیر پہ ایسا عظیم نہیں ہوا تھا— کے ساتھ نماز ظہر ادا کی۔ اس کے بعد آپ لوگوں کے درمیان تشریف لائے اور اونٹوں کے پالان سے بنے ایک بلند منبر پر جلوہ افروز ہو کر بلند آواز سے خطبہ دینا شروع کیا اور فرمایا:

”حمد و ستائش تمہا خدا کے لئے ہے، ہم اسی سے مدد چاہتے ہیں اور اسی پر ایمان رکھتے ہیں، اور اسی پر توکل کرتے ہیں، اور اپنے نفس امارہ اور برائی کے شر سے محفوظ رہنے کیلئے اس خدا کی پناہ لیتے ہیں، جس کے سوا گمراہوں کی ہدایت و راہنمائی کرنے والا کوئی نہیں ہے۔“

ہم گواہی دیتے ہیں کہ جس کی خداوند کریم ہدایت کرے کوئی اسے گمراہ نہیں کر سکتا ہم اس خدا کی گواہی دیتے ہیں جس کے علاوہ کوئی خدا نہیں ہے اور محمد خدا کا بندہ اور اس کا رسول ہے۔

اے لوگو! خدائے لطیف و خبیر نے مجھے خبر دی ہے کہ ہر پیغمبر کی رسالت کی مدت اس سے پہلے کی رسالت کی آدمی ہوتی ہے، اور میں جلدی ہی دعوت حق کو لبیک کہنے والا اور تم سے رخصت ہونے والا ہوں، میں ذمہ دار ہوں اور تم لوگ بھی ذمہ دار ہو، میرے بارے میں کیا سوچتے ہو؟

اصحاب رسول نے کہا: ہم گواہی دیتے ہیں کہ آپ نے دین خدا کی تبلیغ کی، ہمارے بارے میں خیر خواہی کی اور ہماری نصیحت فرمائی اور اس راہ میں سعی و کوشش کی، خدائے تعالیٰ آپ کو جزائے خیر عطا کرے۔

مجمع پر خاموشی چھا گئی تو پیغمبر نے فرمایا: کیا تم لوگ گواہی نہیں دیتے ہو کہ خدا کے سوا کوئی خدا نہیں ہے اور محمد خدا کا بندہ اور اس کا رسول ہے، جنت، جہنم اور موت حق ہے۔ بے شک قیامت آئے گی اور خدائے تعالیٰ زمین میں دفن لوگوں کو پھر سے زندہ کرے گا؟
اصحاب رسول: جی ہاں! جی ہاں! ہم گواہی دیتے ہیں۔

پیغمبر: میں تم لوگوں کے درمیان دو گراں قدر چیزیں چھوڑ رہا ہوں تم لوگ ان کے ساتھ کیسا برتاؤ کرو گے؟

ایک شخص: یہ دو گراں قدر چیزیں کیا ہیں؟

پیغمبر: نقل اکبر خدا کی کتاب ہے کہ اس کا ایک سرا خدا سے وابستہ اور دوسرا سراسر تمہارے ہاتھ میں ہے، خدا کی کتاب کو مضبوطی سے پکڑے رہو تا کہ گمراہ نہ ہو اور "نقل اصغر" میری عزت اور اہل بیت ہیں۔ خدا نے مجھے خبر دی ہے کہ میری یہ دو یادگاریں قیامت تک ایک دوسرے سے جدا نہیں

ہوں گی۔

خبردار، اے لوگو: خدا کی کتاب اور میری عمرت سے آگے بڑھنے کی کوشش نہ کرنا اور نہ ان سے پیچھے رہنا تا کہ نابودی سے بچے رہو۔

اس موقع پر پیغمبرؐ نے علیؑ کا ہاتھ پکڑ کر انھیں اس قدر بلند کیا کہ آپؐ کے بغل کے نیچے کی سفیدی نمایاں ہو گئی اور تمام لوگوں نے علیؑ کو پیغمبرؐ کے پہلو میں دیکھا اور انھیں اچھی طرح سے پہچان لیا۔ سب سمجھ گئے کہ اس اجتماع کا مقصد، علیؑ سے مربوط کوئی اعلان ہے۔ سب شوق و بے تابی کے ساتھ پیغمبرؐ کی بات سننے کے منتظر تھے۔

پیغمبرؐ: اے لوگو! مؤمنوں پر، خود ان سے زیادہ سزاوار کون ہے؟

اصحاب پیغمبرؐ: خدا اور اس کا پیغمبرؐ بہتر جانتے ہیں۔

پیغمبرؐ: ”خدا میرا مولا اور میں مؤمنوں کا مولا اور ان پر، خود ان سے زیادہ اولیٰ و سزاوار ہوں۔

اے لوگو! ”من کنت مولاہ فعلیٰ مولاہ“، یعنی جس جس کا میں مولا — خود اس سے زیادہ اس پر سزاوار — ہوں اس کے علیؑ بھی مولا ہیں“ اور پیغمبرؐ نے اس جملہ کو تین بار فرمایا۔

اس کے بعد فرمایا: پروردگارا! اس کو دوست رکھ، جو علیؑ کو دوست رکھے اور اس کو دشمن رکھ جو علیؑ سے دشمنی کرے۔ خدایا! علیؑ کے دوستوں کی مدد فرما اور اس کے دشمنوں کو ذلیل و خوار فرما۔ خداوند! علیؑ کو مرکز حق قرار دے“

اس کے بعد پیغمبرؐ نے فرمایا: ضروری ہے کہ اس جلسہ میں حاضر لوگ اس خبر کو غیر حاضروں

تک پہنچادیں اور دوسروں کو بھی اس واقعہ سے باخبر کریں۔

ابھی غدیر کا اجتماع برقرار تھا کہ فرشتہٴ وحی تشریف لایا اور پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو

بشارت دی کہ خداوند کریم فرماتا ہے: میں نے آج اپنے دین کو مکمل کر دیا اور اپنی نعمتیں تم پر تمام کر دیں

۱۔ احمد بن حنبل کا کہنا ہے کہ پیغمبرؐ نے اس جملہ کو چار بار فرمایا

اور اس پر راضی ہوا کہ یہ کامل شدہ اسلام تمہارا دین ہوگا۔
یہاں پر پیغمبر اسلام نے تکبیر کی آواز بلند کرتے ہوئے فرمایا: میں خدا کا شکر گزار ہوں کہ اس نے اپنے دین کو مکمل کر دیا اور اپنی نعمت تمام کر دی اور میری رسالت اور میرے بعد علی کی ولایت پر خوشنود ہوا۔

اس کے بعد پیغمبرؐ اپنی جگہ سے نیچے تشریف لائے، آپ کے اصحاب گروہ گروہ آگے بڑھے اور علیؑ کو مبارکباد دی اور انہیں اپنے اور تمام مؤمنین و مومنات کا مولا کہا۔
اس موقع پر رسول خدا کا شاعر ”حسان بن ثابت“ اٹھا اور اس نے اس تاریخی رواد کو شعر کی صورت میں بیان کر کے اسے ابدی رنگ دیدیا۔ اس کے اس قصیدہ سے صرف دو ابیات کا ترجمہ یہاں پر ذکر کرتے ہیں:

”پیغمبرؐ نے علیؑ سے فرمایا: کھڑے ہو جاؤ! میں نے تمہیں اپنے بعد لوگوں کی قیادت اور راہنمائی کیلئے منتخب کیا ہے۔^۱ جس کا میں مولا ہوں، اس کے علیؑ بھی مولا ہیں۔

لوگو! تم لوگوں پر لازم ہے کہ علیؑ کے سچے اور حقیقی دوست رہو۔

اوپر بیان شدہ رواد غدیر کے واقعہ کا خلاصہ ہے جو اہل سنت علماء کے اسناد و ماخذ میں ذکر ہوا ہے۔ شیعوں کی کتابوں میں یہ واقعہ تفصیل کے ساتھ بیان ہوا ہے۔

مرحوم طبری نے اپنی کتاب ”احتجاج“ میں پیغمبرؐ خدا سے ایک مفصل خطبہ نقل کیا ہے، شائقین

اس کتاب میں اس خطبہ کا مطالعہ کر سکتے ہیں۔^۲

۱۔ ﴿الْيَوْمَ اكْمَلْتُ لَكُمْ دِينَكُمْ وَ اَتَمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِي وَ رَضِيْتُ لَكُمْ الْاِسْلَامَ دِيْنًا﴾ (ماکہ/۳)

فقال له قم يا علي فاني رضيتك من بعدى اماماً و هادياً

فمن كنت مولاه فهذا وليه فكونوا له اتباع صدق موالياً

۳۔ احتجاج طبری، ج ۱ ص ۳۲۷ طبع نجف۔

غدیر کا واقعہ لافانی و جاویدانی ہے

خدائے تعالیٰ کا حکیمانہ ارادہ یہی تھا کہ غدیر کا تاریخی واقعہ تمام زمانوں اور صدیوں میں ایک زندہ تاریخ کی صورت میں باقی رہے تاکہ ہر زمانے کے لوگ اس کی طرف جذب ہوں اور ہر زمانے میں اسلام کے اہل قلم تفسیر، حدیث، کلام اور تاریخ پر قلم اٹھاتے وقت اس موضوع پر لکھیں اور مذہبی مقررین، وعظ و سخن کی مجلسوں میں اسے بیان کرتے ہوئے اس کو امامؑ کے ناقابل انکار فضائل میں شمار کریں۔ ادباء و شعراء بھی اس واقعہ سے الہام حاصل کر کے اپنے ادبی ذوق و شوق کو اس واقعہ سے مزین کر کے مولا کے تئیں اپنے جذبات مختلف زبانوں میں بہترین ادبی نمونوں کی صورت میں پیش کریں۔

یہ بات بلا سبب نہیں کہ انسانی تاریخ میں بہت کم ایسے واقعات گزرے ہیں جو واقعہ غدیر کی طرح علماء، محدثین، مفسرین، متکلمین، فلاسفہ، مقررین، شعراء، مؤرخین و سیرت نگاروں کی توجہ کا مرکز بنے ہیں ان سب نے اس واقعہ کو قدر کی نگاہ سے دیکھا اور عقیدت کے پھول نچھاور کئے ہیں۔ بیشک اس واقعہ کے لافانی اور جاویدانی ہونے کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ اس واقعہ سے مربوط قرآن مجید میں دو آیتیں نازل ہوئی ہیں۔ چونکہ قرآن لافانی اور ابدی ہے اس لئے یہ واقعہ بھی لافانی ہو گیا ہے اور ہرگز ختم ہونے والا نہیں ہے۔

اس کے علاوہ چونکہ گزشتہ زمانہ میں اسلامی معاشرہ اور آج کا شیعہ معاشرہ اس روز کو مذہبی عیدوں میں ایک عظیم عید شمار کرتا ہے اور اس مناسبت سے ہر سال باشکوہ تقریبات منعقد کرتا ہے لہذا قدرتی طور پر غدیر کے تاریخی واقعہ نے ابدیت کا رنگ اختیار کر لیا ہے اور کبھی فراموش ہونے والا نہیں ہے۔

۱- آء، ﴿يَا أَيُّهَا الرُّسُلُ بَلِّغُوا مَا نَزَّلَ الْبَيْكُ مِنْ رَبِّكُ..﴾ (مائدہ/ ۶۷)، اور آء شریفہ ﴿الْيَوْمَ اكْتَمَلْتُ لَكُمْ

دِينَكُمْ وَاتَّمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِي..﴾ (مائدہ/ ۳)

تاریخ کا مطالعہ کرنے سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ ۱۸ ذی الحجۃ الحرام کا دن مسلمانوں کے درمیان عید غدیر کے طور پر معروف تھا، یہاں تک کہ ”ابن خلکان“ فاطمی خلیفہ مستعلی بن المستنصر کے بارے میں لکھتا ہے:

”سن ۲۸۷ھ عید غدیر کے دن، کہ ۱۸ ذی الحجۃ الحرام ہے، لوگوں نے اس کی بیعت کی^۱ المستنصر باللہ کے بارے میں ”العیدی“ لکھتا ہے:

”وہ سن ۲۸۷ھ میں جب ماہ ذی الحجۃ میں ۱۲ شہین باقی بچی تھیں، فوت ہوا، یہ شب وہی ۱۸ ویں ذی الحجۃ کی شب ہے، اور شب عید غدیر ہے“^۲

ابن خلکان نے ہی اس شب کو عید غدیر کی شب کا نام نہیں دیا ہے بلکہ ”مسعودی“^۳ اور ”شعالبی“^۴ نے بھی اس شب کو امت اسلامیہ کی مشہور و معروف شبوں میں شمار کیا ہے۔

عید غدیر کے دن جشن و سرور کی تقریبات کا سلسلہ اس دن خود پیغمبرؐ کے عمل سے شروع ہوا ہے۔ کیونکہ اس دن پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مہاجرین و انصار بلکہ اپنی بیویوں کو بھی حکم دیا تھا کہ علیؑ کے پاس جا کر انہیں اس عظیم فضیلت کی مبارکباد دیں۔

زید بن ارقم کہتے ہیں: مہاجرین میں سے سب سے پہلے جن افراد نے علیؑ کے ہاتھ پر بیعت کی، ابو بکر، عمر، عثمان، طلحہ اور زبیر تھے اور مبارکباد کی یہ تقریب اس دن سورج ڈوبنے تک جاری رہی۔

۱۔ وفيات الاعيان، ج ۱، ص ۶۰۔

۲۔ وفيات الاعيان، ج ۱، ص ۲۴۳۔

۳۔ التنبیہ والاشراف، ص ۲۲۔

۴۔ شمارة القلوب، ص ۵۱۱۔

واقعہ کی لافانیت کے دیگر دلائل

اس تاریخی واقعہ کی اہمیت کیلئے اتنا ہی کافی ہے کہ ۱۱۰ صحابیوں نے اسے نقل کیا ہے۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اتنی بڑی جمعیت میں سے صرف ان ہی افراد نے غدیر کے واقعہ کو نقل کیا ہے، بلکہ سنی علماء کی کتابوں میں اس واقعہ کے صرف ۱۱۰ راوی ذکر ہوئے ہیں۔ یہ بات صحیح ہے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک لاکھ کے مجمع میں تقریر فرمائی، لیکن ان میں بہت سے لوگ حجاز سے دور دراز کے علاقوں سے تعلق رکھنے والے تھے، جن سے کوئی حدیث نقل نہیں ہوئی ہے، یا اگر نقل ہوئی بھی ہو تو ہم تک نہیں پہنچی ہے۔ ان میں سے اگر کسی جماعت نے اس واقعہ کو نقل بھی کیا ہے تو تاریخ ان کے نام درج کرنے میں کامیاب نہیں ہوئی۔

دوسری صدی ہجری میں — جو عصر تابعین کے نام سے مشہور ہے — نو اسی افراد نے اس حدیث کو نقل کیا ہے۔

بعد والی صدیوں میں حدیث کے بہت سے راوی سنی علماء تھے ان میں سے تین سو ساٹھ راویوں نے اس حدیث کو اپنی کتابوں میں نقل کیا ہے اور ان میں سے بہت سے لوگوں نے اس حدیث کے صحیح اور محکم ہونے کا اعتراف بھی کیا ہے۔

تیسری صدی ہجری میں ۹۲ (بانے) سنی علماء نے، چوتھی صدی میں تینتالیس (۴۳)، پانچویں صدی میں جو بیس (۲۳)، چھٹی صدی میں بیس (۲۰)، ساتویں صدی میں اکیس (۲۱)، آٹھویں صدی میں اٹھارہ (۱۸)، نویں صدی میں سولہ (۱۶)، دسویں صدی میں (۱۳) چودہ، گیارہویں صدی میں بارہ (۱۲)، بارہویں صدی میں تیرہ (۱۳)، تیرہویں صدی میں بارہ (۱۲) اور چودھویں صدی میں بیس (۲۰) سنی علماء نے اس حدیث کو نقل کیا ہے۔

مذکورہ علماء کی ایک جماعت نے اس حدیث کی نقل پر ہی اکتفاء نہیں کی ہے بلکہ اس کے اسناد اور مفہوم پر مخصوص کتابیں لکھی ہیں۔

عالم اسلام کے عظیم اور نامور تاریخ دان، طبری نے ”الولایۃ فی طرق حدیث الغدیر“ کے موضوع پر کتاب لکھی ہے اور اس میں اس حدیث کو ستر (۷۰) سے زیادہ طریقوں سے، پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے نقل کیا ہے۔

ابن عقدہ کو فی نے اپنے رسالہ ”ولایت“ میں اس حدیث کو ایک سو پچاس (۱۵۰) افراد سے

نقل کیا ہے۔

جن افراد نے اس تاریخی واقعہ کی خصوصیات کے بارے میں مخصوص کتابیں لکھی ہیں، ان کی

تعداد چھبیس (۲۶) ہے۔ ممکن ہے اس سے زیادہ افراد ہوں جنہوں نے اس موضوع پر کتابیں یا

مقالات لکھے ہیں لیکن تاریخ میں ان کا نام درج نہیں ہوا ہے یا ہماری رسائی ان تک نہیں ہے۔

شیعہ علماء نے بھی اس تاریخی واقعہ پر گراں بہا کتابیں لکھی ہیں کہ ان تمام کتابوں میں جامع

ترین اور تاریخی کتاب علامہ مجاہد مرحوم آیت اللہ ایبکی کی کتاب ”الغدیر“ ہے۔

ہم نے امام کی زندگی کے اس پہلو کے بارے میں ان کی اس کتاب سے کافی استفادہ کیا

ہے۔

بیسویں فصل

حدیث غدیر

(تیسرا حصہ)

غدیر کے باشکوہ اجتماع کا مقصد؟

گزشتہ بحثوں سے اچھی طرح واضح اور ثابت ہو گیا کہ غدیر کا واقعہ قطعی اور یقینی طور پر ایک تاریخی واقعہ ہے اور اس میں کسی قسم کا شک و شبہ کرنا بدیہی امور میں شک کرنے کے مترادف ہے۔ اسلامی احادیث میں شاید ہی کوئی ایسی حدیث ہو جو متواتر اور قطعی ہونے کے لحاظ سے اس حدیث کی برابری کر سکے۔

اس لئے ہم اس کی سند کے بارے میں مزید بحث و گفتگو نہیں کریں گے بلکہ اب اس کے مفاد و مفہوم کی وضاحت کرنے کی کوشش کریں گے۔

اس حدیث کو سمجھنے کی کنجی یہ ہے کہ جملہ ”من كنت مولاه فعلى مولاه“ میں وارد شدہ لفظ ”مولیٰ“ کو سمجھ لیں اس لفظ کے معنی کو سمجھنے کے بعد قدرتی طور پر حدیث کا مفہوم بھی واضح ہو جائے گا۔

سب سے پہلے یہ امر قابل غور ہے کہ قرآن مجید میں لفظ ”مولیٰ“، ”اولیٰ“ اور ”ولی“ کے معنی میں استعمال ہوا ہے، جیسے:

﴿فَالْيَوْمَ لَا يُوَظِّدُ مِنْكُمْ فِدْيَةٌ وَلَا مِنَ الَّذِينَ كَفَرُوا مَأْوَاكُمُ النَّارُ هِيَ

مَوْلَاكُمْ وَبَنَسِ الْمَصِيرُ ﴿۱﴾

تو آج (قیامت کے دن) نہ تم سے کوئی فدویہ یا عوض لیا جائے گا اور نہ کفار سے، تم سب کا ٹھکانا جہنم ہے وہی تم سب کا صاحب اختیار (مولا) ہے اور تمہارا بدترین انجام ہے۔^۱
اسلام کے بڑے اور نامور مفسرین اس آئے شریفہ کی تفسیر میں کہتے ہیں: اس آیت میں ”مولیٰ“ کا لفظ ”اولیٰ“ کے معنی میں ہے، کیونکہ یہ افراد، جو ناشائستہ اور برے اعمال کے مرتکب ہوئے ہیں تو ان کیلئے ان اعمال کے عوض جہنم کی آگ کے سوا کوئی اور چیز سزاوار نہیں ہے۔^۲
۲۔ ﴿يَدْعُوا الْمَنْ ضَرَّهُ أَقْرَبُ مِنْ نَفْعِهِ لِبَنَسِ الْمَوْلَىٰ وَ لِبَنَسِ الْعَشِيرِ﴾
”یہ اس بت کو پکارتا ہے جس کا نقصان اس کے فائدے سے زیادہ قریب تر ہے وہ اس کا بدترین سرپرست (ولی) اور بدترین ساتھی ہے“۔^۳

یہ آئے شریفہ اپنے مضمون اور گزشتہ آیات کے قرینہ کی روشنی میں مشرکوں اور بت پرستوں کے عمل سے متعلق ہے کہ وہ بتوں کو اپنا صاحب اختیار (ولی) جانتے تھے اور اسے اپنے سرپرست (ولی) کی حیثیت سے مانتے تھے اور ”ولی“ کی حیثیت سے ہی ان کو پکارتے تھے۔
ان دو آیتوں اور اسی طرح دوسری آیات۔ جن کے ذکر سے ہم صرف نظر کرتے ہیں۔
سے اجمالی طور سے ثابت ہوتا ہے کہ ”مولیٰ“ کے معنی وہی ”اولیٰ“ اور ”ولی“ کے ہیں۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ جملہ ”من کنت مولاہ فہذا علی مولاہ“ کا مقصد کیا ہے؟ کیا اس کا مقصد وہی نفوس پر تصرف رکھنے میں اولیٰ ہونا ہے جس کا لازمہ کسی شخص کا انسان پر ولایت مطلقہ رکھنا ہے یا حدیث کا مفہوم کچھ اور ہے جیسا کہ بعض لوگوں نے تصور کیا ہے کہ حدیث غدیر میں

۱۔ حدید/۱۵

۲۔ ای اولیٰ لکم ما اسلفتم من الذنوب

۳۔ ج/۱۳

”مولیٰ“ دوست اور ناصر کے معنی میں ہے۔

بے شمار قرآن اس کے گواہ ہیں کہ ”مولیٰ“ سے مراد وہی پہلا معنی ہے جسے علماء اور دانشوروں نے ولایت مطلقہ سے تعبیر کیا ہے اور قرآن مجید نے خود پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بارے میں فرمایا ہے:

﴿النَّبِيُّ أَوْلَىٰ بِالْمُؤْمِنِينَ مِنْ أَنفُسِهِمْ﴾

بیشک نبی تمام مؤمنین سے ان کے نفوس کی نسبت زیادہ اولیٰ ہے۔

اگر کوئی شخص (تسلط اور تصرف کے لحاظ سے) کسی کی جان پر خود اس سے زیادہ شائستہ و سزاوار ہو تو وہ قدرتی طور پر اس کے مال پر بھی یہی اختیار رکھتا ہوگا۔ اور جو شخص کسی انسان کی جان و مال پر اولیٰ بالتصرف ہو، وہ اس کے بارے میں ولایت مطلقہ رکھتا ہے۔

اس بنا پر انسان کو اس (ولی) اس کے تمام احکام کی موہو اطاعت کرنی چاہئے اور جس چیز سے وہ منع کرے اس سے باز رہنا چاہئے۔

یہ عہدہ اور منصب، خدا کی طرف سے پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو دیا گیا تھا۔ آپ خود ذاتی طور پر ہرگز اس منصب و مقام کے حامل نہیں تھے۔

واضح تر الفاظ میں یوں کہا جائے گا کہ یہ خدائے تعالیٰ ہے جس نے پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو لوگوں کی جان و مال پر مسلط فرمایا ہے۔ آپ کو ہر قسم کے امر و نہی کے اختیارات دئے ہیں اور آپ کے احکام و اوامر کی مخالفت کو خدا کے احکام کی مخالفت جانا ہے۔

چونکہ قطعی اور یقینی دلائل سے یہ ثابت ہو چکا ہے کہ اس حدیث میں ”مولیٰ“ کے معنی وہی ہیں جو آیہ شریفہ میں ”اولیٰ“ کے ہیں، لہذا قدرتی طور پر امیر المؤمنین حضرت علیؑ اسی منصب و مقام کے حامل ہوئے جس کے آیہ شریفہ کی نص کے مطابق پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تھے، یعنی اپنے

زمانے میں امت کے پیشوا اور معاشرے کے رہبر اور لوگوں کی جان و مال پر اولیٰ و بالتصرف کا اختیار رکھنے والے اور امامت کا یہی وہ عظیم اور بلند مرتبہ ہے جسے ولایت الہیہ سے تعبیر کیا جاتا ہے (یعنی وہ ولایت جو خدا کی طرف سے بعض خاص افراد کو وسیع پیمانے پر عطا ہوتی ہے)

اب ہم وہ قرآن و شواہد بیان کرتے ہیں جن سے پوری طرح ثابت ہوتا ہے کہ اس حدیث میں لفظ ”مولیٰ“ کے معنی تمام امور میں (اولیٰ بالتصرف) اور صاحب اختیار ہونے کے علاوہ کچھ اور نہیں ہے۔

ذیل میں ایسے چند شواہد ملاحظہ ہوں:

۱۔ غدیر کے تاریخی واقعہ کے دن رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے شاعر حسان بن ثابت حضور اکرمؐ سے اجازت حاصل کر کے کھڑے ہوئے اور پیغمبر اکرمؐ کے بیانات کے مضمون کو اشعار کے سانچے میں ڈھال کر پیش کیا۔ یہاں قابل توجہ نکتہ یہ ہے کہ اس فصیح، بلیغ، اور عربی زبان کے رموز سے واقف شخص نے لفظ ”مولیٰ“ کی جگہ پر امام و ہادی کا لفظ استعمال کیا ہے، ملاحظہ ہو:

فقال له قم يا علي فانسى رضيتك من بعدى اماماً و هادياً

یعنی پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت علیؑ کی طرف رخ کر کے ان سے فرمایا:

اٹھو کہ میں نے تمہیں اپنے بعد لوگوں کا امام و ہادی مقرر کر دیا ہے“

واضح رہے کہ حسان نے پیغمبرؐ کے کلام میں موجود لفظ ”مولیٰ“ سے امت کی امامت،

پیشوائی اور ہدایت کے علاوہ کوئی اور معنی نہیں لئے ہیں!

صرف حسان ہی لفظ ”مولیٰ“ سے یہ نہیں سمجھے، بلکہ اس کے بعد بھی اسلام کے عظیم شعرا

— جن میں سے اکثر اعلیٰ درجے کے شعرا اور بعض عربی زبان کے استاد شمار ہوتے تھے — نے

بھی اس لفظ سے وہی معنی لئے ہیں جو حسان نے سمجھے تھے، یعنی امت کی امامت و پیشوائی۔

۲۔ امیر المؤمنین نے معاویہ کو لکھے گئے اپنے چند اشعار میں حدیث غدیر کے بارے میں یوں فرمایا ہے:

و اوجب لی ولایتہ علیکم رسول اللہ یوم غدیر خم
 ”رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے میری ولایت کو تم لوگوں پر غدیر کے دن واجب فرمایا ہے“

علیؑ سے بہتر کون ہو سکتا ہے جو ہمارے لئے حدیث کے حقیقی مفہوم کو واضح کر سکے؟ جبکہ شیعہ و سنی آپؑ کے علم، امانتداری اور تقویٰ کے سلسلے میں اتفاق نظر رکھتے ہیں۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ حضرت حدیث غدیر سے استدلال کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

”پیغمبر خدا نے غدیر کے دن میری ولایت کو تم لوگوں پر واجب فرمایا“

کیا اس وضاحت سے یہ مطلب نہیں نکلتا ہے کہ غدیر کے دن حاضر تمام لوگوں نے آنحضرتؐ کے بیانات سے دینی سرپرستی اور معاشرے کی رہبری کے علاوہ کوئی اور مفہوم نہیں سمجھا تھا؟

خود حدیث میں ایسے قرائن موجود ہیں جو اس بات کی گواہی دیتے ہیں کہ پیغمبر اسلامؐ کے اس جملہ کا وہی مطلب، یعنی حضرت علیؑ کا ”اولی بالتصرف“ صاحب اختیار ہونا ہے۔ کیونکہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جملہ ”من کنت مولاه“ فرمانے سے پہلے یوں فرمایا تھا:

”الست اولیٰ بکم من انفسکم“

کیا میں تم لوگوں پر تمہارے نفوس سے زیادہ اختیار نہیں رکھتا ہوں؟

اس جملہ میں پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ”اولیٰ بکم من انفسکم“ سے استفادہ فرمایا ہے اور اپنے آپ کو تمام لوگوں پر ان کے نفوس سے زیادہ صاحب اختیار بتایا ہے۔

اس کے فوراً بعد فرماتے ہیں: ”من کنت مولاه فهذا علی مولاه“

ان دو جملوں کی ترتیب سے ذکر کئے جانے کا مقصد کیا ہے؟ کیا اس سے پیغمبر اکرم صلی اللہ

علیہ وآلہ وسلم کا مقصد یہ نہیں ہے کہ علیؑ بھی میری طرح لوگوں کے نفوس پر صاحب اختیار ہیں جسے آپؐ نے پہلے اپنے لئے ثابت فرمایا اور یہ جو آپؐ نے فرمایا کہ: ”اے لوگو! وہی منصب و مقام جس کا میں حامل ہوں، علیؑ بھی اسی منصب کے حامل ہیں“ اگر پیغمبرؐ کا مقصد اس کے علاوہ کچھ اور ہوتا تو اپنی اولویت کے بارے میں پہلے لوگوں سے اقرار لینے کی ضرورت ہی نہیں تھی۔

۴۔ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی تقریر کی ابتداء میں لوگوں سے اسلام کے تین اہم اصول (توحید، نبوت، معاد) کے بارے میں اقرار لیتے ہوئے فرمایا:

”الَسْتُمْ تَشْهَدُونَ أَنْ لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ وَأَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهُ وَرَسُولُهُ وَأَنَّ الْجَنَّةَ حَقٌّ وَالنَّارَ حَقٌّ“

یعنی، کیا تم لوگ گواہی نہیں دیتے ہو کہ خدا کے سوا کوئی پروردگار نہیں ہے، محمدؐ اس کا بندہ اور رسولؐ ہے اور بہشت و جہنم حق ہیں۔

یہ اقرار لینے کا مقصد کیا ہے؟ کیا اس کا مقصد اس کے علاوہ کچھ اور ہے کہ پیغمبرؐ اسلام لوگوں کے ذہنوں کو اس پر آمادہ کرنا چاہتے تھے کہ علیؑ کے بارے میں جس منصب کا اعلان کرنے والے ہیں وہ انہی اصولوں کے مانند اہم ہے، اور لوگ جان لیں کہ آپؐ کی ولایت و خلافت کا اقرار اسلام کے مذکورہ تین اصول کے مانند ہے جس کا سب نے اقرار و اعتراف کیا ہے؟ اگر ”مولیٰ“ کا مقصد دوست اور مددگار لیا جائے تو اس صورت میں جملوں کا سلسلہ ہی ٹوٹ جاتا ہے اور پیغمبرؐ کے کلام کی بلاغت و پاکداری ختم ہو جاتی ہے۔ کیونکہ منصب ولایت سے الگ ہٹ کر حضرت علیؑ خود ایسے عظیم مسلمان تھے جنہوں نے ایسے معاشرہ میں پرورش پائی تھی جہاں پر تمام مومنوں سے دوستی کی ضرورت کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں تھی چہ جائیکہ علیؑ جیسے مومن سے دوستی جسے پیغمبرؐ اس اہتمام و شان کے ساتھ ایک بڑے اجتماع میں اعلان فرماتے! اور اس صورت میں یہ امر اتنا اہم بھی نہیں تھا کہ اسلام کے تین بنیادی اصولوں کے برابر قرار پاتا۔

۵۔ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنے خطبہ کے آغاز میں اپنی رحلت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

”انہ یوشک ان ادعی فاجیب“

”قریب ہے کہ میں دعوت حق کو لبیک کہوں“

یہ جملہ اس امر کی حکایت کرتا ہے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنی رحلت کے بعد کیلئے کوئی اہتمام و اقدام کرنا چاہتے تھے تا کہ اپنے بعد پیدا ہونے والے خلفاً کو پر کریں۔ اور بلاشبہ واضح ہے کہ جو چیز اس خلفاً کو پر کر سکتی تھی وہ صرف حضرت علیؑ کی خلافت و امامت تھی کہ رسول خدا کی رحلت کے بعد امور کی باگ ڈور حضرت علیؑ اپنے ہاتھ میں لے لیں، نہ کہ علیؑ کی محبت و دوستی یا ان کی نصرت و مدد!

۶۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جملہ ”من کنت مولاه“ کے بعد یوں فرمایا:

اللہ اکبر علی اکمال الدین و اتمام النعمة و رضی الرب برسالتی و

الولاية لعلی بن ابی طالب

میں خدا کی طرف سے تکمیل دین، اتمام نعمت، اپنی رسالت اور علیؑ ابن ابیطالب کی ولایت پر تکبیر کہتا ہوں۔

۷۔ اس سے واضح اور بہتر کیا گیا ہو سکتی ہے کہ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے منبر سے نیچے تشریف لانے کے بعد شیخین اور اصحاب رسولؐ کی ایک بڑی جماعت نے حضرت علیؑ کی خدمت میں مبارک باد پیش کی اور مبارک باد کی سلسلہ سورج ڈوبنے تک جاری رہا؟ مزے کی بات یہ ہے کہ شیخین پہلے افراد تھے جنہوں نے امام سے کہا:

”هنيئاً لك يا علي بن ابي طالب اصبحت و اتمسيت مولی كل مؤمن و مومنة“

”مبارک ہو آپ کو یہ منصب، اے علیؑ! کہ آپ ہر مومن زن و مرد کے مولیٰ ہو گئے“

حقیقت میں حضرت علیؑ اس روز امت کی سرپرستی و رہبری کے علاوہ کسی اور منصب کے مالک نہیں بنے تھے جیسی وہ اس قسم کی مبارکباد کے مستحق قرار پائے اور اسی وجہ سے اس دن ایسے کی بے مثال تقریب اور ایسے عظیم اجتماع کا اہتمام کیا گیا۔

۸۔ اگر مقصد صرف علیؑ کی دوستی کا اعلان تھا تو یہ ضروری نہیں تھا کہ پیغمبر اسلامؐ ایسے موسم گرما میں حجاج کے ایک لاکھ کے مجمع کو رگڑا کر اور لوگوں کو تپتی ریت پر بٹھا کر مفصل خطبہ بیان کرتے اور اس کے بعد اس مسئلہ کو پیش کرتے۔

کیا قرآن مجید نے مؤمن افراد کو ایک دوسرے کا بھائی نہیں پکارا ہے؟ جیسا کہ فرمایا ہے:

﴿إِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ إِخْوَةٌ﴾^۱

”باایمان لوگ آپس میں ایک دوسرے کے بھائی ہیں“

کیا قرآن مجید نے مؤمنوں کا تعارف ایک دوست کے دوسرے کی حیثیت سے نہیں کر لیا ہے جیسا کہ فرماتا ہے:

﴿وَالْمُؤْمِنُونَ وَالْمُؤْمِنَاتُ بَعْضُهُمْ أَوْلِيَاءُ بَعْضٍ﴾

”باایمان لوگ ایک دوسرے کے دوست ہیں“^۲

علیؑ بھی تو اسی باایمان معاشرے کی ایک فرد تھے، اس لئے اس کی ضرورت ہی نہیں تھی کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم الگ سے اور وہ بھی اس اہتمام کے ساتھ علیؑ کی دوستی اور محبت کا اعلان فرماتے!!

جو کچھ ہم نے بیان کیا اس سے بالکل واضح ہو جاتا ہے کہ بعض لوگوں کا یہ دعویٰ، کہ حدیث غدیر کا مقصد علیؑ کی دوستی یا ان کی نصرت و مدد کو ضروری قرار دینا تھا اور پیغمبرؐ کے خطبہ میں لفظ ”مولیٰ“

دوست یا ناصر کے معنی میں ہے، درحقیقت تعصب پر مبنی ایک قسم کی غیر منصفانہ تفسیر اور بہت بچگانہ باتیں ہیں۔ گزشتہ قرائن اور اس خطبہ کے اول سے آخر تک بغور مطالعہ کے بعد یہ ناقابل انکار حقیقت معلوم ہو جاتی ہے کہ پیغمبر اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے خطبہ میں ”مولیٰ“ کا ایک ہی معنی ہے، یعنی ”صاحب اختیار“ (اولیٰ بالتصرف) ہونا۔ اور اگر یہ کہا جائے کہ اس کا مقصد سیادت اور آقا ئی ہے اور مولیٰ ”سید“ کے معنی میں ہے تو اس سیادت کا مقصد وہ دینی والہی سیادت ہے جو امام کی اطاعت کو لوگوں پر واجب اور ضروری قرار دیتی ہے۔

اکیسویں فصل

دو سوالوں کے جواب

دو سوال

پیغمبر اکرم ﷺ نے حضرت علیؑ کی بلا فصل خلافت کا اعلان غدیر خم میں کر دیا اور ان کی اطاعت و پیروی تمام مسلمانوں پر لازم و واجب قرار دے دی۔ یہاں دو سوال سامنے آتے ہیں۔

(۱)۔ جب حضرت علیؑ کی جانشینی کا اعلان ایسے مخصوص دن کر دیا گیا تھا تو پھر اصحاب نے آنحضرتؐ کی رحلت کے بعد حضرت علیؑ کی وصایت و ولی عہدی کو اندیکھا کرتے ہوئے کسی اور کی پیروی کیوں کی؟

(۲)۔ امام علیؑ علیہ السلام نے اپنی زندگی میں اپنی امامت کو ثابت کرنے کے لئے اس حدیث سے استدلال کیوں نہیں کیا؟

پہلے سوال کا جواب:

اگرچہ اصحاب پیغمبرؐ کے ایک گروہ نے حضرت علیؑ کی جانشینی کو فراموش کرتے ہوئے غدیر کے الہی فرمان سے چشم پوشی کر لی اور بہت سے لاطلق و لاپرواہ لوگوں نے۔ جن کی مثالیں ہر معاشرہ میں بہت زیادہ نظر آتی ہیں۔ ان لوگوں کی پیروی کی، لیکن ان کے مقابل ایسی نمایاں شخصیتیں اور اہم افراد بھی تھے جو حضرت علیؑ کی امامت و پیشوائی کے سلسلہ میں وفادار رہے۔ اور انھوں نے امام علیؑ کے علاوہ کسی اور کی پیروی نہیں کی۔ یہ افراد اگرچہ تعداد میں پہلے گروہ

سے کم اور اقلیت شمار ہوتے تھے، لیکن کیفیت و شخصیت کے اعتبار سے پیغمبر اکرم ﷺ کے ممتاز اصحاب میں شمار ہوتے تھے جیسے: سلمان فارسی، ابوذر غفاری، مقداد بن اسود، عمار یاسر، ابی بن کعب، ابو ایوب انصاری، خزیمہ بن ثابت، بریدہ اسلمی، ابوہشیم بن التیہان، خالد بن سعید اور ایسے ہی بہت سے افراد کہ تاریخ اسلام نے ان کے نام اور ان کی زندگی کے خصوصیات و نیک صفات، موجودہ خلافت پر ان کی تنقیدیں اور امیر المؤمنین علیؑ سے ان کی وفاداریوں کو پوری باریکی کے ساتھ محفوظ کیا ہے۔

تاریخ اسلام نے دو سو پچاس صحابیوں کا ذکر کیا ہے کہ یہ سب کے سب امام کے وفادار تھے اور زندگی کے آخری لمحہ تک ان کے دامن سے وابستہ رہے۔ ان میں سے بہت سے لوگوں نے امام کی محبت میں شہادت کا شرف بھی حاصل کیا۔ ۱

افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ صرف حضرت علی علیہ السلام کی وصایت و ولایت کا مسئلہ ہی نہیں ہے جس میں آنحضرتؐ کے صریح و صاف حکم کے باوجود پیغمبر اکرم ﷺ کے بعض صحابیوں نے مخالفت اور آنحضرتؐ کے حکم سے چشم پوشی کی، بلکہ تاریخ کے صفحات کی گواہی کے مطابق خود پیغمبرؐ کے زمانہ میں بھی بعض افراد نے آنحضرتؐ کے صاف حکم کو اندیکھا کیا، اس کی مخالفت کی اور اس کے

۱۔ سید علی خان مرحوم "مدنی" نے اپنی گرانتقد کتاب "الدرجات الرفیعة فی طبقات الشیعة الامامیة" میں اصحاب پیغمبر اکرم ﷺ میں سے ایسے افراد کے نام و خصوصیات بیان کئے ہیں جو حضرت علی علیہ السلام کے وفادار رہے۔ مرحوم شرف الدین عالمی نے بھی اپنی تالیف العقول المهمة ص ۷۷ تا ۱۹۶ میں اپنی تحقیق کے ذریعہ ان میں مزید افراد کا اضافہ کیا ہے۔ اس کتاب کے مؤلف نے بھی "تخصیصہای اسلامی در شیخہ" کے عنوان سے ایک کتاب تدوین کی ہے جس میں ان افراد کے حالات زندگی اور امیر المؤمنین حضرت علی علیہ السلام سے ان کی ولایت کے مراتب و تین ماخذ کے ساتھ بیان کئے ہیں اور یہ کتاب چند جلدوں میں شائع ہوگی۔

خلاف اپنے نظریہ کا اظہار کیا۔

دوسری لفظوں میں پیغمبر اکرم ﷺ کے بعض اصحاب جب آنحضرتؐ کے حکم کو اپنے باطنی خواہشات اور سیاسی خیالات کے مخالف نہیں پاتے تھے تو دل سے اسے قبول کر لیتے تھے۔ لیکن اگر پیغمبر اکرم ﷺ کی تعلیمات کے کسی حصہ کو اپنے سیاسی افکار و خیالات اور اپنی جاہ پسند خواہشات کے خلاف پاتے تھے تو پیغمبر اکرم ﷺ کو اس کام کی انجام دہی سے روکنے کی کوشش کرتے تھے اور اگر پیغمبرؐ اپنی بات پر جے رہتے تو آنحضرتؐ کے حکم سے سرتابی کی کوشش کرتے تھے یا اعتراض کرنے لگتے تھے اور کوشش کرتے تھے کہ خود پیغمبر اکرم ﷺ ان کی پیروی کریں۔

ذیل میں ہم بعض اصحاب کی اس ناپسندیدہ روش کے چند نمونے بیان کرتے ہیں:

(۱)۔ پیغمبر اکرم ﷺ نے اپنی زندگی کے آخری ایام میں حکم دیا کہ میرے لئے قلم و دوات لے آؤ تاکہ میں ایک ایسی تحریر لکھ دوں جس کی روشنی میں میرے بعد میری امت کبھی گمراہ نہ ہو۔ لیکن وہاں موجود بعض افراد نے اپنی مخصوص سیاسی سوجھ بوجھ سے یہ سمجھ لیا کہ اس تحریر کا مقصد اپنے بعد کے لئے جانشین کے تعین کا تحریری اعلان ہے لہذا پیغمبر اکرم ﷺ کے صریح حکم کی مخالفت کر بیٹھے اور لوگوں کو قلم و کاغذ لانے سے روک دیا!

ابن عباس نے اپنی آنکھوں سے اشک بہاتے ہوئے کہا: مسلمانوں کی مصیبت اور بدبختی اسی روز سے شروع ہوئی جب پیغمبر اکرم ﷺ بیمار تھے اور آپؐ نے اس وقت قلم کاغذ لانے کا حکم دیا تاکہ ایسی چیز لکھ دیں کہ ان کے بعد امت اسلام گمراہ نہ ہو۔ لیکن اس موقع پر بعض حاضرین نے جھگڑا اور اختلاف شروع کر دیا۔ بعض لوگوں نے کہا: قلم، کاغذ لے آؤ بعض نے کہا نہ لاؤ۔ آخر کار پیغمبرؐ نے جب یہ جھگڑا اور اختلاف دیکھا تو جو کام انجام دینا چاہتے تھے نہ کر سکے۔ ۱

(۲)۔ مسلمانوں کے لشکر کے سردار "زید بن حارثہ" رومیوں کے ساتھ، جنگ موتہ میں قتل ہو گئے

اس واقعہ کے بعد پیغمبر اسلام ﷺ نے اپنی زندگی کے آخری ایام میں ایک فوج تشکیل دی اور مہاجرین و انصار کی تمام شخصیتوں کو اس میں شرکت کا حکم دیا اور لشکر کا علم اپنے ہاتھوں سے ”اسامہ ابن زید“ کے حوالے کیا۔ ناگہاں اسی روز آنحضرتؐ کو شدید بخار آیا جس نے آنحضرتؐ کو سخت مریض کر دیا۔ اس دوران پیغمبرؐ کے بعض اصحاب کی جانب سے اختلاف، جھگڑے اور پیغمبر خداؐ کے صاف حکم سے سرتابی کا آغاز ہوا۔ بعض لوگوں نے ”اسامہ“ جیسے جوان کی سرداری پر اعتراض کرتے ہوئے اپنے غصہ کا اظہار کیا اور آنحضرتؐ سے اس کی معزولی کا مطالبہ کیا۔ ایک گروہ جن کے لئے آنحضرتؐ کی موت قطعی ہو چکی تھی، جہاد میں جانے سے نال مثل کرنے لگا کہ ایسے حساس موقع پر مدینہ سے باہر جانا اسلام اور مسلمانوں کے حق میں اچھا نہیں۔

پیغمبر اسلام ﷺ جب بھی اپنے اصحاب کی اس نال مثل اور لشکر کی روانگی میں تاخیر سے آگاہ ہوتے تھے تو آپؐ کی پیشانی اور چہرہ سے غصہ کے آثار ظاہر ہونے لگتے تھے اور اصحاب کو آمادہ کرنے کے لئے دوبارہ تاکید کے ساتھ حکم دیتے تھے اور فرماتے تھے: جلد از جلد مدینہ ترک کرو اور روم کی طرف روانہ ہو جاؤ۔ لیکن اس قدر تاکیدات کے باوجود ان ہی اسباب کے پیش نظر جو اوپر بیان ہو چکے ہیں، ان افراد نے آنحضرتؐ کے صاف و صریح حکم کو ان سنا کر دیا اور اپنی ذاتی مرضی آگے پیغمبر اکرم ﷺ کی پیہم تاکیدات کو ٹھکرا دیا۔

(۳)۔ پیغمبر اکرم ﷺ کے فرمان سے بعض اصحاب کی مخالفت کے یہی دو مذکورہ نمونے نہیں ہیں۔ اس قسم کے افراد نے سرزمین ”حدیبیہ“ پر بھی، جب آنحضرتؐ قریش سے صلح کی قرارداد باندھ رہے تھے، سختی کے ساتھ آنحضرتؐ کی مخالفت کی اور ان پر اعتراض اور تنقیدیں کیں۔

پیغمبر اسلام ﷺ کی رحلت کے بعد ان لوگوں کی آنحضرتؐ کے دستورات سے مخالفت اس سے زیادہ ہے۔ کیونکہ ان ہی افراد نے بعض اسباب کے تحت نماز اور اذان کی کیفیت میں تبدیلی کر دی ”ازدواج موقت“ کی آیت کو ان دیکھا کر دیا ماہ رمضان مبارک کی شبوں کے نوافل کو جنھیں

فراہمی پڑھنا چاہئے ایک خاص کیفیت کے ساتھ جماعت میں تبدیل کر دیا اور میراث کے احکام میں بھی تبدیلیاں کیں۔

ان میں سے ہر ایک تبدیلیوں اور تحریفوں اور آنحضرتؐ کے حکم سے ان سرتانیوں کے اسباب و علل اور اصطلاحی طور سے ”نص کے مقابلہ میں اجتہاد“ کی تشریح اس کتاب میں ممکن نہیں ہے۔ اس سلسلہ میں کتاب ”المراجعات“ کے صفحات ۲۱۸-۲۸۲ تک اور ایک دوسری کتاب ”النص و الاجتہاد“ کا مطالعہ مفید ہوگا، جو اسی موضوع سے متعلق لکھی گئی ہے۔

اسحاب پیغمبر اکرم ﷺ کی مخالفت اور شرارت اس قدر بڑھ گئی تھی کہ قرآن مجید نے انھیں سخت انداز میں رسول خدا ﷺ کے دستورات سے مخالفت اور ان پر سبقت کرنے سے منع کیا چنانچہ فرماتا ہے:

﴿فليحذر الذين يخالفون عن امره ان تصيبهم فتنة او يصيبهم

عذاب اليم﴾ ۱

یعنی جو لوگ رسول خدا ﷺ کے فرمان کی مخالفت کرتے ہیں وہ اس بات سے ڈریں کہ کہیں کسی بلا یا دردناک عذاب میں مبتلا نہ ہوں۔

اور فرماتا ہے:

”يا ايها الذين آمنوا لا تقدموا بين يدي الله ورسوله واتقوا

الله ان الله سميع عليم“ ۲

اے ایمان لانے والو! خدا اور اس کے رسول پر سبقت نہ کرو اور اللہ سے ڈرو

کہ بلاشبہ اللہ سننے اور جاننے والا ہے۔

جو لوگ یہ اصرار کرتے تھے کہ پیغمبر اکرم ﷺ ان کے نظریات و خیالات کی پیروی کریں
خداوند عالم انہیں بھی وارننگ دیتا ہے:

﴿وَاعْلَمُوا أَن فِيكُمْ رَسُولَ اللَّهِ لَوْ يُطِيعُكُمْ فِي كَثِيرٍ مِّنَ الْأَمْرِ
لَعَنْتُمْ﴾ ۱

اور جان لو کہ تمہارے درمیان رسول خدا جیسی شخصیت موجود ہے۔ اگر بہت
سے امور میں وہ تمہارے نظریات کی پیروی کریں گے تو تم زحمت میں
پڑ جاؤ گے۔

یہ حادثات اور یہ آیات اس بات کی صاف حکایت کرتی ہیں کہ اصحاب پیغمبر میں ایک گروہ
تھا جو آنحضرت کی مخالفت کرتا تھا اور جیسی ان کی اطاعت کرنا چاہئے اطاعت نہیں کرتا تھا۔ بلکہ یہ
لوگ کوشش کرتے تھے کہ جو احکام الہی ان کے افکار اور سلیقہ سے سازگار نہیں تھے، ان کی پیروی نہ
کریں۔ حتیٰ کہ یہ کوشش کرتے تھے کہ خود رسول خدا کو اپنے نظریات کا پیرو بنا لیں۔

افسوس رسول خدا ﷺ کی رحلت کے بعد سیاسی میدان میں دوڑنے والے اور سقیفہ نیز
فرمانشی شوریٰ کی تشکیل دینے والے یہی لوگ جنہوں نے غدیر خم میں پیغمبر اسلام ﷺ کے صاف
حکم اور نص الہی کو اپنی باطنی خواہشات کے مخالف پایا لہذا بہت تیزی سے اسے بھلا دیا۔

دوسرے سوال کا جواب:

جیسا کہ اس سوال میں درپردہ اذکار کیا گیا ہے، یہ یاد دلانا ضروری ہے کہ حضرت علیؑ نے
اپنی زندگی میں متعدد موقعوں پر حدیث غدیر کے ذریعہ اپنی حقانیت اور اپنی خلافت پر استدلال کیا

ہے۔ حضرت امیر المومنین جب بھی موقع مناسب دیکھتے تھے مخالفتوں کو حدیث غدیر یاد دلاتے تھے۔ اس طرح سے اپنی حیثیت لوگوں کے دلوں میں محکم فرماتے تھے اور حقیقت کے طالب افراد پر حق کو آشکار کر دیتے تھے۔

نہ صرف حضرت امام علیؑ بلکہ بنت رسول خدا حضرت فاطمہ زہراؑ اور ان کے دونوں صاحب زادوں امام حسن اور امام حسین علیہما السلام اور اسلام کی بہت سی عظیم شخصیتوں مثلاً عبداللہ بن جعفر، عمار یاسر، اصغ بن نباتہ، قیس بن سعد، حتیٰ کچھ اموی اور عباسی خلفاء مثلاً عمر بن عبدالعزیز اور مامون الرشید اور ان سے بھی بالاتر حضرت کے مشہور مخالفتوں مثلاً عمرو بن عاص اور..... نے حدیث غدیر سے احتجاج و استدلال کیا ہے۔

حدیث غدیر سے استدلال حضرت علیؑ کے زمانہ سے آج تک جاری ہے اور ہر زمانہ و ہر صدی میں حضرت کے دوست داروں نے حدیث غدیر کو حضرت کی امامت و ولایت کے دلائل میں شمار کیا ہے۔ ہم یہاں ان احتجاجات اور استدلالوں کے صرف چند نمونے پیش کرتے ہیں:

۱۔ سب جانتے ہیں کہ خلیفہ دوم کے حکم سے بعد کے خلیفہ کے انتخاب کے لئے چھ رکنی کمیٹی تشکیل پائی تھی کمیٹی کے افراد کی ترکیب ایسی تھی کہ سبھی جانتے تھے کہ خلافت حضرت علیؑ تک نہیں پہنچے گی کیونکہ عمر نے اس وقت کے سب سے بڑے سرمایہ دار عبدالرحمان بن عوف (جو عثمان کے قریبی رشتہ دار تھے) کو ویٹو پاور دے رکھا تھا۔ ان کا حضرت علیؑ کے مخالف گروہ سے جو رابطہ تھا اس سے صاف ظاہر تھا کہ وہ حضرت علیؑ کو اس حق سے محروم کر دیں گے۔

بہر حال جب خلافت عبدالرحمان بن عوف کے ذریعہ عثمان کو بخش دی گئی تو حضرت علیؑ نے شوریٰ کے اس فیصلہ کو باطل قرار دیتے ہوئے فرمایا: میں تم سے ایک ایسی بات کے ذریعہ احتجاج کرتا ہوں جس سے کوئی شخص انکار نہیں کر سکتا یہاں تک کہ فرمایا: میں تم لوگوں کو تمہارے خدا کی قسم دیتا ہوں کیا تمہارے درمیان کوئی ایسا شخص ہے جس کے بارہ میں پیغمبر اکرم ﷺ نے فرمایا ہو

”من كنت مولاه فهذا عليّ مولاہ، اللّٰهم وال من والاہ وانصر من نصرہ ليلبغ الشاهد الغائب“ یعنی میں جس جس کا مولا ہوں یہ علیٰ بھی اس کے مولا ہیں۔ خدا یا تو اسے دوست رکھے اور اس کی مدد فرما جو علیٰ کی مدد کرے۔ حاضرین ہر بات غائب لوگوں تک پہنچائیں۔

اس موقع پر شوریٰ کے تمام ارکان نے حضرت علیٰ کی تصدیق کرتے ہوئے کہا: خدا کی قسم یہ فضیلت آپ کے علاوہ کسی اور میں نہیں پائی جاتی۔ ۱

امام علیٰ کا احتجاج و استدلال اس حدیث سے صرف اسی ایک موقع پر نہیں تھا بلکہ امام نے حدیث غدیر سے دوسرے مقامات پر بھی استدلال فرمایا ہے۔

۲۔ ایک روز حضرت علیؑ کوفہ میں خطبہ دے رہے تھے۔ تقریر کے دوران آپ نے مجمع سے خطاب کر کے فرمایا: میں تمہیں خدا کی قسم دیتا ہوں، جو شخص بھی غدیر خم میں موجود تھا اور جس نے اپنے کانوں سے سنا ہے کہ پیغمبر اکرم ﷺ نے مجھے اپنی جانشینی کے لئے منتخب کیا ہے وہ کھڑے ہو کر گواہی دے۔ لیکن صرف وہی لوگ کھڑے ہوں جنہوں نے خود اپنے کانوں سے پیغمبر ﷺ سے یہ بات سنی ہے۔ وہ نہ اٹھیں جنہوں نے دوسروں سے سنا ہے۔ اس وقت تیس افراد اپنی جگہ پر کھڑے ہوئے اور انہوں نے حدیث غدیر کی گواہی دی۔

یہ بات ملحوظ رکھنی چاہئے کہ جب یہ بات ہوئی تو غدیر کے واقعہ کو گزرے ہوئے پچیس سال ہو چکے تھے۔ اور پیغمبر ﷺ کے بہت سے اصحاب کوفہ میں نہیں تھے، یا اس سے پہلے انتقال کر چکے تھے اور کچھ لوگوں نے بعض اسباب کے تحت گواہی دینے سے کوتاہی کی تھی۔

”علامہ امینی“ مرحوم نے اس احتجاج و استدلال کے بہت سے حوالے اپنی گرانقدر کتاب ”الغدیر“ میں نقل کئے ہیں۔ شائقین اس کتاب کی طرف رجوع کر سکتے ہیں۔ ۲

۱۔ مناقب خوارزمی ص ۲۱

۲۔ الغدیر، ج ۱ ص ۱۵۳۔ ۱۵۱

۳۔ حضرت عثمان کی خلافت کے زمانہ میں مہاجرین و انصار کی دوسو بڑی شخصیتیں مسجد نبیؐ میں جمع ہوئیں۔ ان لوگوں نے مختلف موضوعات پر گفتگو شروع کی۔ یہاں تک کہ بات قریش کے فضائل ان کے کارناموں اور ان کی ہجرت کی آئی اور قریش کا ہر خاندان اپنی نمایاں شخصیتوں کی تعریف کرنے لگا۔ جلسہ صبح سے ظہر تک چلتا رہا اور لوگ باتیں کرتے رہے حضرت امیر المومنینؓ پورے جلسہ میں صرف لوگوں کی باتیں سنتے رہے۔ اچانک مجمع آپ کی طرف متوجہ ہوا اور درخواست کرنے لگا کہ آپ بھی کچھ فرمائیے۔ امام علیہ السلام لوگوں کے اصرار پر اٹھے اور خاندان پیغمبر ﷺ سے اپنے رابطہ اور اپنے درخشاں ماضی سے متعلق تفصیل سے تقریر فرمائی۔ یہاں تک کہ فرمایا:

کیا تم لوگوں کو یاد ہے کہ غدیر کے دن خداوند عالم نے پیغمبر اکرم ﷺ کو یہ حکم دیا تھا کہ جس طرح تم نے لوگوں کو نماز، زکات اور حج کی تعلیم دی یوں ہی لوگوں کے سامنے علی کی پیشوائی کا بھی اعلان کر دو۔ اسی کام کے لئے پیغمبر ﷺ نے ایک خطبہ ارشاد فرمایا اور اس میں فرمایا: خداوند عالم نے ایک فریضہ میرے اوپر عائد کیا ہے۔ میں اس بات سے ڈرتا تھا کہ کہیں اس الہی پیغام کو پہنچانے میں لوگ میری تکذیب نہ کریں، لیکن خداوند عالم نے مجھے حکم دیا کہ میں یہ کام انجام دوں اور یہ خوش خبری دی کہ اللہ مجھے لوگوں کے شر سے محفوظ رکھے گا۔

اے لوگو! تم جانتے ہو کہ خدا میرا مولا ہے اور میں مومنین کا مولا ہوں اور ان کے حق میں ان سے زیادہ اولیٰ بالتصرف ہوں؟ سب نے کہا ہاں۔ اس وقت پیغمبر اسلام ﷺ نے فرمایا: علی! اٹھو۔ میں اٹھ کھڑا ہوا۔ آنحضرتؐ نے مجمع کی طرف رخ کر کے فرمایا: ”من كنت مولاه فهذا علی مولاه اللهم وال من والاه و عاد من عاداه“ جس کا میں مولا ہوں اس کے یہ علی مولا ہیں۔ خدا یا! تو اسے دوست رکھ جو علیؑ کو دوست رکھے اور اسے دشمن رکھ جو علیؑ سے دشمنی کرے۔

اس موقع پر سلمان فارسی نے رسول خدا ﷺ سے دریافت کیا: علیؑ ہم پر کیسی ولایت

رکھتے ہیں؟ پیغمبر اکرم ﷺ نے فرمایا: ”ولانہ کولانہی، من کنت اولیٰ بہ من نفسہ، فعلتیٰ اولیٰ بہ من نفسہ“ یعنی تم پر علیؑ کی ولایت میری ولایت کے مانند ہے۔ میں جس جس کی جان اور نفس پر اولویت رکھتا ہوں علیؑ بھی اس کی جان اور اس کے نفس پر اولویت رکھتے ہیں۔ ۱۔

۲۔ صرف حضرت علیؑ نے ہی حدیث غدیر سے اپنے مخالفوں کے خلاف احتجاج و استدلال نہیں کیا ہے بلکہ پیغمبر اسلام ﷺ کی پارہ بھگر حضرت فاطمہ زہرا سلام اللہ علیہا نے ایک تاریخی دن جب آپ اپنے حق کو ثابت کرنے کے لئے مسجد میں خطبہ دے رہی تھیں، تو پیغمبر اکرم ﷺ کے اصحاب کی طرف رخ کر کے فرمایا:

کیا تم لوگوں نے غدیر کے دن کو فراموش کر دیا جس دن پیغمبر اکرم ﷺ نے حضرت علیؑ کے بارے میں فرمایا تھا:

”من کنت مولاه فهذا اعلیٰ مولاه“ جس کا میں مولا ہوں یہ علیؑ اس کے مولا ہیں۔

۵۔ جس وقت امام حسن علیہ السلام نے معاویہ سے صلح کی قرارداد باندھنے کا فیصلہ کیا تو مجمع

میں کھڑے ہو کر ایک خطبہ دیا اور اس میں فرمایا:

”خداوند عالم نے پیغمبر اکرم ﷺ کے اہل بیت کو اسلام کے ذریعہ مکرم اور گرامی قرار دیا

ہمیں منتخب کیا اور ہر طرح کی رجس و کثافت کو ہم سے دور رکھا..... یہاں تک کہ فرمایا:

پوری امت نے سنا کہ پیغمبر اکرم ﷺ نے حضرت علیؑ سے فرمایا: تم کو مجھ سے وہ

نسبت ہے جو ہارون کو موسیٰ سے تھی“

تمام لوگوں نے دیکھا اور سنا کہ پیغمبر اکرم ﷺ نے غدیر خم میں حضرت علیؑ کا ہاتھ

تھام کر لوگوں سے فرمایا:

”من کنت مولاه فعلیٰ مولاه اللهم وال من والاه وعاد من

۱۔ افراند السمطین، باب ۵۸۔ حضرت علیؑ علیہ السلام نے ان تین موقعوں کے علاوہ مسجد کوفہ میں ”یوم الریجہ“ نام کے دن، روز

”جمل“، حدیث الرکبان“ کے واقعہ میں اور ”جنگ صفین“ میں حدیث غدیر سے اپنی امامت پر استدلال کیا ہے۔

عادہ " ۱

۶۔ امام حسین علیہ السلام نے بھی سرزمین مکہ پر حاجیوں کے مجمع میں۔ جس میں اصحاب پیغمبر ﷺ کی ایک بڑی تعداد موجود تھی۔ خطبہ دیتے ہوئے فرمایا:

”میں تمہیں خدا کی قسم دیتا ہوں کیا تم جاننے ہو کہ پیغمبر اسلامؐ نے غدیر کے دن حضرت علیؑ کو اپنی خلافت و ولایت کے لئے منتخب کیا اور فرمایا کہ: حاضرین یہ بات غائب لوگوں تک پہنچادیں“ پورے مجمع نے کہا: ہم گواہی دیتے ہیں۔

۷۔ ان کے علاوہ جیسا کہ ہم عرض کر چکے ہیں، پیغمبر اسلام ﷺ کے کئی اصحاب مثلاً عمار یاسر، زید بن ارقم، عبداللہ بن جعفر، اصغ بن نباتہ اور دوسرے افراد نے بھی حدیث غدیر کے ذریعہ حضرت علیؑ کی خلافت و امامت پر استدلال کیا ہے۔ ۲

۱۔ بیانچ المودۃ ص ۳۸۴

۲۔ مزید آگاہی کے لئے "الفدیر" ج ۱ ص ۲۱۳۶ تا ۲۱۳۷ ملاحظہ فرمائیں۔ اس کتاب میں بائیس استدلال حوالوں کے

بایسویں فصل

حدیث ”ثقلین“ اور حدیث ”سفینہ“

قرآن و معترض کا باہم الٹو رشتہ

حدیث ثقلین! اسلام کی ان قطعی و متواتر احادیث میں سے ہے جسے علمائے اسلام نے پیغمبر اسلام ﷺ سے نقل کیا ہے۔ مختلف زمانوں اور صدیوں میں اس حدیث کے متعدد اور قابل اعتماد اسناد پیغمبر اسلام ﷺ کی حدیث کو قطعی ثابت کرتے ہیں اور کوئی بھی صحیح فکر اور صحیح مزاج والا شخص اس کی صحت و استواری میں شک نہیں کر سکتا۔

علمائے اہل سنت کے نقطہ نظر سے اس حدیث کا جائزہ لینے سے پہلے ہم ان سے بعض افراد کی گواہی یہاں نقل کرتے ہیں:

”منادی“ کے بقول: یہ حدیث ایک سو بیس (۱۳۰) سے زیادہ صحابیوں نے پیغمبر اسلام ﷺ سے نقل کی ہے۔ ۲

۱۔ نقل فتح ”ق“ اور ”ث“ اس کے معنی ہیں کوئی بہت نصیب اور قیمتی امر۔ اور کسر ”ث“ اور جزم ”ق“ سے مراد کوئی گرفتار چیز۔

ابن حجر عسقلانی کے بقول: حدیث ثقلین میں (۲۰) سے زیادہ طریقوں سے نقل ہوئی

ہے!

عظیم شیعہ عالم علامہ میر حامد حسین مرحوم، جن کا انتقال ۱۳۰۶ھ میں ہوا ہے، انہوں نے مذکورہ حدیث کو علمائے اہل سنت کی ۵۰۲ کتابوں سے نقل کیا ہے۔ حدیث کی سند اور دلالت سے متعلق ان کی تحقیق چھ جلدوں میں اصفہان سے شائع ہو چکی ہے، شائقین اس کتاب کے ذریعہ اس حدیث کی عظمت سے آگاہ ہو سکتے ہیں۔

اگر ہم اہل سنت کے مذکورہ راویوں پر شیعہ راویوں کا اضافہ کر دیں تو حدیث ثقلین معتبر اور متواتر ہونے کے اعتبار سے اعلیٰ درجہ پر نظر آتی ہے، جس کے اعتبار کا مقابلہ حدیث غدیر کے علاوہ کسی اور حدیث سے نہیں کیا جاسکتا۔ حدیث ثقلین کا متن یہ ہے

”انی تارک فیکم الثقلین کتاب اللہ و عترتی اهل بیتی ما ان تمسکتکم

بہما لن تضلوا ابدا ولن یفترقا حتی یردا علی الحوض“

”میں تمہارے درمیان دو گرانقدر امانتیں چھوڑے جا رہا ہوں، ایک اللہ کی کتاب اور

دوسرے میری عترت و اہل بیٹ ہیں، جب تک تم ان دونوں سے متمسک رہو گے ہرگز

گمراہ نہ ہو گے یہ دونوں کبھی ایک دوسرے سے جدا نہ ہوں گے، یہاں تک کہ میرے

پاس حوض کوثر پہنچ جائیں“

البتہ یہ حدیث اس سے بھی وسیع انداز میں نقل ہوئی ہے۔ حتیٰ ابن حجر نے لکھا ہے کہ

پیغمبر اکرم ﷺ نے اس حدیث کے آخر میں اضافہ فرمایا:

”هَذَا عَلِيٌّ مَعَ الْقُرْآنِ وَالْقُرْآنُ مَعَ عَلِيٍّ لَا يَفْتَرِقَانِ“ ۲

۱۔ صواعق محرقة، عسقلانی، حدیث ۱۳۵

۲۔ بیان فی المودۃ ص ۳۲۲ و ص ۳۰۷

”یعنی یہ علی ہمیشہ قرآن کے ساتھ ہیں اور قرآن علی کے ہمراہ ہے۔ یہ دونوں ایک دوسرے سے جدا نہیں ہوں گے“

مذکورہ بالا روایت حدیث کی وہ مختصر صورت ہے جسے اسلامی محدثوں نے نقل کیا ہے اور اس کی صحت پر گواہی دی ہے۔ لیکن حدیث کی صورت میں اختلاف کی وجہ یہ ہے کہ پیغمبر اکرم ﷺ نے مختلف موقعوں پر الگ الگ تعبیروں میں لوگوں کو قرآن و اہل بیت کے اٹوٹ رشتہ سے آگاہ کیا ہے۔ پیغمبر اکرم ﷺ نے ان دونوں جہتوں کے ربط کو حجۃ الوداع کے موقع پر غدیر خم میں۔ منبر پر ۱۲، اور بستر بیماری پر ۱۳ جب کہ آپ کا حجرہ اصحاب سے بھرا ہوا تھا، بیان کیا تھا۔ اور اجمال و تفصیل کے لحاظ سے حدیث کے اختلاف کی وجہ یہ ہے کہ آنحضرتؐ نے اسے مختلف تعبیروں سے بیان کیا ہے۔

اگرچہ حدیث مختلف صورتوں سے نقل ہوئی ہے اور پیغمبر اکرم ﷺ نے اپنی دو یادگاروں کو کبھی ”ثقلین“، کبھی ”ذخینین“ اور کبھی ”امرین“ کے الفاظ سے یاد کیا ہے، اس کے باوجود سب کا مقصد ایک ہے اور وہ ہے قرآن کریم اور پیغمبر اکرم ﷺ کی عزت و اہل بیت کے درمیان اٹوٹ رابطہ کا ذکر۔

حدیث ثقلین کا مفاد

حدیث ثقلین کے مفاد پر غور کرنے سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ پیغمبر اکرم ﷺ کی عزت و اہل بیت گناہ تو گناہ خطا و لغزش سے بھی محفوظ و معصوم ہیں، کیوں کہ جو چیز صبح قیامت تک قرآن کریم سے اٹوٹ رشتہ و رابطہ رکھتی ہے وہ قرآن کی ہی طرح (جسے خداوند عالم نے ہر طرح کی تحریف سے محفوظ رکھا ہے) ہر خطا و لغزش سے محفوظ ہے۔

۱۔ مستدرک، حاکم، ج ۳، ص ۳۶، ۱۰۹ وغیرہ

۲۔ بحار الانوار، ج ۳۲، ص ۶۱، نقل از مجالس مفید

۳۔ الصواعق المحرقة، ص ۵۸

دوسرے لفظوں میں یہ جو پیغمبر اکرم ﷺ نے فرمایا کہ اسلامی امت صحیح قیامت تک (جب یہ دونوں یادگاریں پیغمبر اکرم ﷺ سے ملاقات کریں گی) ان دونوں سے وابستہ رہے اور ان دونوں کی اطاعت و پیروی کرے، اس سے یہ بات اچھی سمجھی جاسکتی ہے کہ یہ دونوں الہی حجیتیں اور پیغمبر اکرم ﷺ کی یادگاریں، ہمیشہ خطا و غلطی سے محفوظ اور ہر طرح کی کجی و انحراف سے دور ہیں۔ کیوں کہ یہ تصور نہیں کیا جاسکتا کہ خداوند عالم کسی عاصی و گناہگار انسان کی اطاعت ہم پر واجب کرے یا قرآن مجید جیسی خطا سے پاک کتاب کا کسی خطا کار گروہ سے الٹا رشتہ قرار دیدے۔ قرآن کا ہمسرا اور اس کے برابر تھا وہی گروہ ہو سکتا ہے جو ہر گناہ اور ہر خطا و لغزش سے پاک ہو۔

جیسا کہ ہم پہلے عرض کر چکے ہیں، امامت کے لئے سب سے اہم شرط عصمت یعنی گناہ و خطا سے اس کا محفوظ رہنا ہے۔ آگے بھی ہم عقل کی روشنی میں الہی پیشواؤں اور رہبروں کے لئے اس کی ضرورت پر ثبوت فراہم کریں گے حدیث ثقلین بخوبی اس بات کی گواہ ہے کہ پیغمبر اکرم ﷺ کی عزت و اہل بیت قرآن کی طرح ہر عیب و نقص، خطا و گناہ سے پاک ہیں اور چونکہ ان کی پیروی واجب کی گئی ہے لہذا انہیں بہر حال گناہ و عصیت سے پاک ہونا چاہئے۔

امیر المؤمنین کا حدیث ثقلین سے استدلال

کتاب "احتجاج" کے مؤلف احمد بن علی ابن ابیطالب کتاب "سلیم بن قیس" سے (جو تابعین میں ہیں اور حضرت امیر المؤمنین علیہ السلام کے عظیم شاگرد ہیں) نقل کرتے ہیں کہ عثمان کی خلافت کے دور میں مسجد النبیؐ میں مہاجرین و انصار کا ایک جلسہ ہوا جس میں ہر شخص اپنے فضائل و کمالات بیان کر رہا تھا۔ اس جلسہ میں امام علی علیہ السلام بھی موجود تھے لیکن خاموش بیٹھے ہوئے سب کی باتیں سن رہے تھے۔ آخر کار لوگوں نے امام سے درخواست کی کہ آپ بھی اپنے بارہ میں کچھ بیان کریں، امام نے ایک تفصیلی خطبہ ارشاد فرمایا جس میں چند آیات کی تلاوت بھی فرمائی جو آپ کے حق

میں نازل ہوئی تھی اس کے ساتھ ہی آپ نے ارشاد فرمایا: میں تمہیں خدا کی قسم دیتا ہوں کیا تم جانتے ہو کہ رسول خدا نے اپنی زندگی کے آخری ایام میں خطبہ دیا تھا اور اس میں فرمایا تھا:

”یا ایہا الناس انی تارک فیکم الثقلین کتاب اللہ و عترتی

اہل بیٹی فتمسکوا بہما لاتضلوا“

”اے لوگو! میں تمہارے درمیان دو گرانقدر میراث چھوڑے جا رہا ہوں۔

اللہ کی کتاب اور میرے اہل بیت پس ان دونوں سے وابستہ رہو کہ ہرگز گمراہ

نہ ہو گے۔“

مسلم ہے کہ پیغمبر اکرم ﷺ کی عترت و اہل بیت سے مراد ان سے وابستہ تمام افراد نہیں ہیں کیوں کہ امت کا اس پر اتفاق ہے کہ تمام وابستہ افراد لغزش و گناہ سے پاک و مبرا نہیں تھے بلکہ اس سے مراد وہ معین تعداد ہے جن کی امامت پر شیعہ راسخ عقیدہ رکھتے ہیں۔

دوسرے لفظوں میں اگر ہم حدیث ثقلین کے مفاد کو قبول کر لیں تو عترت و اہل بیت کے افراد اور ان کے مصداق مخفی نہیں رہ جائیں گے کیوں کہ پیغمبر اکرم ﷺ کے فرزندوں یا ان سے وابستہ افراد کے درمیان صرف وہی لوگ اس حدیث کے مصداق ہو سکتے ہیں جو ہر طرح کی لغزش و خطا سے مبرا و پاک ہیں اور امت کے درمیان طہارت، پاکیزگی، اخلاقی فضائل اور وسیع و بکیراں علم کے ذریعہ مسلمانوں میں مشہور ہیں اور لوگ انہیں نام و نشان کے ساتھ پہچانتے ہیں۔

ایک نکتہ کی یاد دہانی

اس مشہور اور متفق علیہ حدیث یعنی حدیث ثقلین کا متن بیان ہو چکا اور ہم نے دیکھا کہ پیغمبر اکرم ﷺ نے ہر جگہ ”کتاب و عترت“ کو اپنی دو یادگار کے عنوان سے یاد کیا ہے اور ان دو اہلی

حجتوں کے باہم انوٹ رشتہ کو ذکر کیا ہے لیکن سنت کی بعض کتابوں میں کہیں کہیں ندرت کے ساتھ ”کتاب اللہ و سنتی“ کے بجائے ”کتاب اللہ و سنتی“ ذکر ہوا ہے اور ایک غیر معتبر روایت کی شکل میں نقل ہوا ہے۔

ابن حجر عسقلانی نے اپنی کتاب ۱ میں حدیث کی دوسری صورت بھی نقل کی ہے اور اس کی توجیہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ: درحقیقت سنت پیغمبر اکرم ﷺ جو قرآنی آیات کی مفسر ہے اس کی بازگشت خود کتاب خدا کی طرف ہے اور دونوں کی پیروی لازم و واجب ہے۔

ہمیں اس وقت اس سے سروکار نہیں کہ یہ توجیہ درست ہے یا نہیں۔ جو بات اہم ہے یہ ہے کہ حدیث ثقلین جسے عام طور سے اسلامی محدثوں نے نقل کیا ہے وہ وہی ”کتاب اللہ و سنتی“ ہے اور اگر جملہ ”کتاب اللہ و سنتی“ بھی پیغمبر اکرم ﷺ سے صحیح و معتبر سند کے ساتھ نقل ہوئی ہوگی تو وہ ایک دوسری حدیث ہوگی۔ جو حدیث ثقلین سے کوئی ٹکراؤ نہ رکھے گی۔ جبکہ یہ تعبیر احادیث کی کتابوں میں کسی قابل اعتماد سند کے ساتھ نقل نہیں ہوئی ہے۔ اور جو شہرت و تواتر پہلی با یوں کہا جائے کہ اصل حدیث ثقلین کو حاصل ہے وہ اسے حاصل نہیں ہے۔

عمرت پیغمبر سفینہ نوح کے مانند

اگر حدیث سفینہ کو حدیث ثقلین کے ساتھ ضم کر دیا جائے تو ان دونوں حدیثوں کا مفاد پیغمبر اسلام ﷺ کے اہل بیت کے لئے فضائل و کمالات کی ایک دنیا کو نمایاں کرتا ہے۔
 سلیم ابن قیس نے لکھا ہے کہ: میں حج کے زمانہ میں مکہ میں موجود تھا میں نے دیکھا کہ جناب ابوذر غفاری کعبہ کے حلقہ کو پکڑے ہوئے بلند آواز میں کہہ رہے ہیں:

اے لوگو! جو مجھے پہچانتا ہے وہ پہچانتا ہے اور جو نہیں پہچانتا میں اسے اپنا تعارف کرانا ہوں۔ میں جناب بن جنادہ ”ابوذر“ ہوں۔ اے لوگو! میں نے پیغمبر اکرم ﷺ سے سنا ہے کہ:

”ان مثل اهل بیتی فی امتی کمثل سفینة نوح فی قومه من

رکبها نجی' ومن ترکها غرق“

میرے اہل بیت کی مثال میری امت میں جناب نوح کی قوم میں ان کی کشتی

کے مانند ہے کہ جو شخص اس میں سوار ہوا اس نے نجات پائی اور جس نے

اسے ترک کر دیا وہ غرق ہو گیا۔ ۱

حدیث سفینہ، حدیث غدیر اور حدیث ثقلین کے بعد اسلام کی متواتر حدیثوں میں سے ہے

اور محدثین کے درمیان عظیم شہرت رکھتی ہے۔

کتاب عبقات الانوار ۲ کے مولف علامہ میر حامد حسین مرحوم نے اس حدیث کو اہل

سنت کے نوے ۹۰ مشہور علماء و محدثین سے نقل کیا ہے۔ ۳

حدیث سفینہ کا مفاد

حدیث سفینہ جس میں پیغمبر اکرم ﷺ کی عزت کو نوح کی کشتی سے تعبیر کیا گیا ہے اس

سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ اہل بیت کی پیروی نجات کا سبب اور ان کی مخالفت نابودی کا سبب ہے۔

اب یہ دیکھنا چاہیے کہ کیا صرف حلال و حرام میں ان کی پیروی کرنا چاہیے اور سیاسی و اجتماعی

مسائل میں ان کے ارشاد و ہدایت پر عمل کرنا واجب نہیں ہے یا یہ کہ تمام موارد میں ان کی پیروی

واجب ہے اور ان کے اقوال اور حکم کو بلا استثناء جان و دل سے قبول کرنا ضروری ہے؟

جو لوگ کہتے ہیں کہ اہل بیت پیغمبر ﷺ کی پیروی صرف دین کے احکام اور حلال و حرام

۱۔ احتجاج طبری، ص ۲۸۸

۲۔ جزء دوم از جلد دوازدهم، ص ۹۱۴ کے بعد ملاحظہ فرمائیں۔

۳۔ مستدرک حاکم، ج ۳، ص ۳۳۴۔ کنز العمال، ج ۱۷، ص ۲۵۰۔ صواعق، ص ۵۷۔ فیض القدر، ج ۲، ص ۳۵۶۔

سے مربوط ہے وہ کسی دلیل کے بغیر پیروی کے موضوع کو محدود کرتے ہیں اور اس کی وسعت کو سمجھنے کی کوشش نہیں کرتے جب کہ حدیث میں اس طرح کی کوئی قید و شرط نہیں ہے۔

لہذا حدیث سفینہ بھی اس سلسلہ میں وارد ہونے والی دوسری احادیث کی طرح اسلامی قیادت و سرپرستی کے لئے اہل بیت کی لیاقت و شائستگی کو ثابت کرتی ہے۔

اس کے علاوہ مذکورہ حدیث اہل بیت کی عصمت و طہارت اور ان کے گناہ و لغزش سے پاک ہونے کی بہترین گواہ ہے، کیونکہ ایک گناہگار و خطاکار بھلا کس طرح دوسروں کو نجات اور گمراہوں کی ہدایت کر سکتا ہے!؟

حضرت امیر المومنین (علیہ السلام) اور ان کے جانشینوں کی ولایت اور امت اسلام کی پیشوائی و رہبری کے لئے ان کی لیاقت و شائستگی کے دلائل اس سے کہیں زیادہ ہیں اور اس مختصر کتاب میں سمیٹے نہیں جاسکتے لہذا ہم اتنے ہی پراکتفا کرتے ہیں اور اپنی گفتگو کا آغاز عصمت کے موضوع سے کرتے ہیں جو الہی رہبروں کے لئے بنیادی شرط ہے۔

تیسویں فصل

ایک شخص کا معصوم ہونا کیسے ممکن ہے

کیا انسانی معاشرہ کی قیادت و رہبری سے بڑھکر کوئی منصب تصور کیا جاسکتا ہے؟ کیا کوئی شخص روحی و جسمی امتیازات کے بغیر زندگی کے کسی ایک پہلو میں بھی معاشرہ کی قیادت کا بوجھ سنبھال سکتا ہے؟ چہ جائیکہ زندگی کے تمام مادی و معنوی پہلوؤں میں!! جو صرف الہی رہبروں یعنی انبیاء و غیرہ سے مخصوص ہے؟

سیاسی لیڈران جو ملک و مملکت کے صرف سیاسی مسائل میں قیادت کرتے ہیں یا اقتصادی مسائل کے ماہرین جو ملک کی اقتصاد کی باگڈور ہاتھ میں رکھتے ہیں ان میدانوں سے متعلق خاص شرائط و صفات کے بغیر۔ جو انہیں دوسروں سے ممتاز و برتر ثابت کرتے ہیں۔ ملک کے اس اعلیٰ سیاسی یا اقتصادی منصب کو حاصل ہی نہیں کر سکتے۔

اگر ایسا ہی ہے تو یہ بات بدرجہ اولیٰ تسلیم کرنی چاہئے کہ انبیاء الہی اور ان کے حقیقی جانشینوں۔ جو انسانی معاشرہ کے تمام میدانوں میں رہبر ہیں۔ میں بھی وہ عالی اور باعظمت صفات و کمالات ہونے چاہئیں جو ان کی رہبری کی حیثیت کو ثابت کریں۔ کیوں کہ درحقیقت ان صفات اور امتیازات کی بنا پر ہی ان افراد کو یہ عظیم منصب عطا کیا گیا ہے۔

آپ ان عظیم افراد کے امتیازات کو حسب ذیل دو عنوانوں میں خلاصہ کر سکتے ہیں:

(۱)۔ گناہ اور خدا کی نافرمانی سے محفوظ رہنا۔

(۲)۔ خدا سے احکام حاصل کرنے اور لوگوں کو ان احکام کی تبلیغ کرنے میں خطا و غلطی سے محفوظ رہنا۔ اس سے پہلے کہ الہی رہبروں کے لئے عصمت کے لازم ہونے کے دلائل بیان کئے جائیں، بہتر ہے کہ خود عصمت کے بارے میں اجمال کے ساتھ یہ گفتگو کی جائے کہ کس طرح ایک شخص گناہ سے محفوظ رہتا ہے۔

عصمت کیا ہے؟

عصمت ایک نفسانی صفت اور ایک باطنی طاقت ہے جو اپنے حامل کو گناہ ہی سے نہیں بلکہ گناہ انجام دینے کی فکر یا خیال سے بھی دور رکھتی ہے۔ دوسرے لفظوں میں یہ خدا کا باطنی خوف ہے جو انسان کو گناہ سے حتیٰ گناہ کے ارادہ سے بھی محفوظ رکھتا ہے۔

یہاں یہ سوال پیش آتا ہے کہ یہ کیسے ممکن ہے کہ ایک شخص تمام گناہوں سے محفوظ رہے اور وہ نہ صرف گناہ نہ کرے بلکہ گناہ اور نافرمانی کے ارادہ سے بھی دور رہے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ گناہ کی برائیوں کے علم کا لازمہ یہ ہے کہ انسان اپنے آپ کو گناہ سے محفوظ رکھے۔ البتہ اس کا مطلب یہ نہیں کہ گناہ کی برائیوں کے سلسلہ میں ہر درجہ کا علم انسان کو گناہ سے محفوظ و معصوم بنا دیتا ہے، بلکہ علم کی حقیقت نمائی اس قدر قوی ہو جو گناہ کے برے آثار کو انسان کی نگاہ میں اس قدر مجسم کر دے کہ انسان ان برے کاموں کے انجام کو اپنی آنکھوں میں مجسم ہوتے ہوئے دیکھے۔ اس صورت میں گناہ اس کے لئے ”محال عادی“ ہو جائے گا۔ ذہن کو اور قریب کرنے کے لئے حسب ذیل مطلب پر توجہ دیں۔

ہم میں سے ہر ایک شخص بعض ایسے اعمال سے جن سے ہماری جان جانے کا خطرہ ہوتا ہے ایک طرح سے محفوظ و معصوم ہیں۔ اس طرح کا تحفظ اس علم کی پیداوار ہے جو ان اعمال کے نتائج کے طور پر ہمیں حاصل ہے مثال کے طور پر ایک دوسرے کے دشمن دو ملک جن کی سرحدیں آپس میں ملی

ہوئی ہیں اور ہر طرف کے فوجی تھوڑے فاصلہ سے بلند برجوں پر قوی ووربینوں، تیز لاسٹوں اور سدھے ہوئے کتوں کے ذریعہ سرحد کی نگرانی کر رہے ہیں اور خاص طور سے کسی کے سرحد پار کرنے پر گہری نظر رکھے ہوئے ہیں کہ اگر کوئی سرحد سے ایک قسم بھی آگے بڑھا گولوں سے بھون دیا جائے گا ایسی صورت میں کوئی عقل مند انسان سرحد پار کرنے کا خیال بھی اپنے ذہن میں نہیں لاسکتا چہ جائیکہ عملاً بہ اقدام کرے۔ ایسا انسان اس عمل کے سلسلہ میں ایک طرح سے محفوظ و معصوم ہے۔

زیادہ دور نہ جائیں، ہر عاقل انسان جسے اپنی زندگی سے پیار ہے، قاتل زہر کے مقابل جس کا کھانا اس کے لئے جان لیوا ہو گا یا بجلی کے ننگے تار کے مقابل جس کا لمس کرنا اسے جلا کر سیاہ کر دے گا یا اس بیمار کی بچی ہوئی غذا کے مقابل۔ جسے ”جذام“ یا ”برص“ کی شدید بیماری ہوئی ہو۔ جس کے کھانے سے اس کے اندر یہ مرض سرایت کر جائے گا، ایک طرح کا تحفظ اور عصمت رکھتا ہے۔ یعنی وہ ہرگز اور کسی بھی قیمت پر یہ اعمال انجام نہیں دیتا اور اس سے ان اعمال کا ہونا ایک ”محال عادی“ ہے۔ اس کا اس طرح سے محفوظ و معصوم رہنے کا سبب بھی ان اعمال کے برے نتائج کا اس کی نظر میں مجسم ہونا ہے۔ عمل کے خطرناک آچار اس کی نظر میں اس قدر مجسم اور اس کے دل کی نگاہ میں اتنے نمایاں ہو جاتے ہیں کہ ان کی روشنی میں کوئی بھی انسان اپنے ذہن میں ان کاموں کے انجام دینے کا خیال تک نہیں لاتا، چہ جائے کہ وہ یہ عمل انجام دے ڈالے۔

ہم دیکھتے ہیں کہ ایک شخص یتیم و بینوا کا مال ہضم کر جانے میں کوئی باک نہیں رکھتا جبکہ اس کے مقابل دوسرا شخص ایک پیسے حرام کھانے سے بھی پرہیز کرتا ہے۔ پہلا شخص پوری بے باکی کے ساتھ یتیموں کا مال کیوں کھا جاتا ہے لیکن دوسرا شخص حرام کے ایک پیسے سے بھی کیوں پرہیز کرتا ہے؟ اس کا سبب یہ ہے کہ پہلا شخص سرے سے اس قسم کی نافرمانی کے برے انجام کا اعتقاد ہی نہیں رکھتا اور اگر قیامت کا تھوڑا بہت ایمان رکھتا بھی ہے جب بھی تیزی سے تمام ہو جانے والی مادی لذتیں اس کے دل کی آنکھوں پر اس کے برے انجام کی طرف سے ایسا پردہ ڈال دیتی ہیں کہ

ایک شخص کا معصوم ہونا کیسے ممکن ہے..... ۲۱۱

ان کے برے آثار کا ایک ہا کا ساسا یہ اس کی عقل کی نگاہوں کے سامنے سے گذر کر رہ جاتا ہے اور اس پر کوئی اثر نہیں ہوتا۔ لیکن دوسرا شخص اس گناہ کے برے انجام پر اتنا یقین رکھتا ہے کہ مال یتیم کا ہر ٹکڑا اس کی نظر میں جہنم کی آگ کے ٹکڑے کے برابر ہوتا ہے اور کوئی عقلمند انسان آگ کھانے کا اقدام نہیں کرتا، کیونکہ وہ علم و بصیرت کی نگاہ سے دیکھ لیتا ہے کہ یہ مال کس طرح جہنم کی آگ میں بدل جاتا ہے۔ لہذا وہ اس عمل کے مقابل محفوظ و معصوم رہتا ہے۔

اگر پہلے شخص کو بھی ایسا ہی علم اور ایسی ہی آگاہی حاصل ہو جائے تو وہ بھی دوسرے شخص کی طرح یتیم کا مال خالمانہ طریقہ سے ہڑپ نہ کرے گا۔ جو لوگ سونے اور چاندی کا دھیرا اکٹھا کر لیتے ہیں اور خدا کی طرف سے واجب حقوق کو ادا نہیں کرتے قرآن مجید ان کے سلسلہ میں فرماتا ہے: یہی سونا چاندی قیامت کے دن آگ میں بدل جائے گا اور اس سے ان کی پیشانی پہلوؤں اور پشت کو داغا جائے گا۔!

اب اگر ایسا خزانہ رکھنے والے اس منظر کو خود اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں اور یہ دیکھ لیں کہ ان جیسے افراد کا کیا انجام ہوا، اس کے بعد انھیں تنبیہ کی جائے کہ اگر تم بھی اپنی دولت کو جمع کر کے رکھو گے اور خدا کی راہ میں خرچ نہیں کرو گے تو تمہارا بھی یہی انجام ہوگا تو وہ بھی فوراً اپنی چھپائی ہوئی دولت کو نکال کر خدا کی راہ میں خرچ کر ڈالیں گے۔

اکثر بعض افراد اسی دنیا میں الہی سزا و عذاب کے اس منظر کو دیکھے بغیر اس آیت کے مفہوم پر اس قدر ایمان رکھتے ہیں جو دیکھی ہوئی چیز پر ایمان سے کم نہیں ہوتا۔ یہاں تک کہ اگر دنیاوی و مادی

۱۔ "یوم یحییٰ علیہا فی نار جہنم فتکویٰ بہا جہاہم و ظہورہم ہذا ما کنتم لا نفسکم فلو قوا ما کنتم

پردے ان کی نگاہوں سے ہٹا دیئے جائیں جب بھی ان کے ایمان میں کوئی فرق نہیں آتا۔ ایسی صورت میں یہ شخص اس (خزانہ جمع کرنے کے) گناہ سے محفوظ رہتا ہے، یعنی ہرگز سونا چاندی اکٹھا نہیں کرتا۔

اب اگر ایک شخص یا ایک گروہ کائنات کے حقائق کے سلسلہ میں کامل اور حقیقی آگاہی و معرفت رکھنے کی وجہ سے تمام گناہوں کے انجام کے سلسلہ میں ایسی ہی حالت رکھتا ہو اور گناہوں کی سزا ان پر اس قدر نمایاں اور واضح ہو کہ مادی حجاب نگاہوں سے اٹھنے یا زمان و مکان کے فاصلوں کے باوجود ان کے ایمان و اعتقاد میں کوئی فرق نہیں آتا تو اس صورت میں یہ شخص یا وہ گروہ ان تمام گناہوں کے مقابل سو فی صدی تحفظ اور عصمت رکھتا ہے۔ نتیجہ میں ان سے نہ صرف گناہ سرزد نہیں ہوتے بلکہ انھیں گناہ کا خیال بھی نہیں آتا۔

لہذا یہ کہنا چاہئے کہ عصمت کسی ایک چیز یا تمام چیزوں میں اعمال کے انجام و نتائج کے قطعی علم اور شدید ایمان کے اثر سے پیدا ہوتی ہے اور ہر انسان بعض امور کے سلسلہ میں ایک طرح کی عصمت رکھتا ہے مگر انبیائے الہی اعمال کے انجام سے مکمل آگاہی اور خدا کی عظمت کی کامل معرفت کی وجہ سے تمام گناہوں کے مقابل مکمل عصمت رکھتے ہیں اور اسی علم و یقین کی بنا پر گناہ کے تمام اسباب، خواہشوں اور شہوتوں پر قابو رکھتے ہیں اور ایک لمحہ کے لئے بھی خدا کے معین کردہ حدود سے سرکشی نہیں کرتے۔

آخر میں اس نکتہ کی طرف توجہ دلانا ضروری ہے کہ یہ صحیح ہے کہ انبیائے کرام گناہ اور ہر طرح کی نافرمانی سے محفوظ ہیں، لیکن اس تحفظ کا یہ مطلب نہیں ہے کہ وہ گناہ کے کام انجام دینے کی توانائی نہیں رکھتے اور خدا کا حکم بجالانے پر مجبور ہیں۔ بلکہ یہ حضرات بھی تمام انسانوں کی طرح عمل کی آزادی اور اختیار رکھتے ہیں اور اطاعت یا نافرمانی دونوں پر انھیں قدرت حاصل ہے لیکن یہ لوگ اپنی باطنی آنکھوں سے۔ جو کائنات کے حقائق سے متعلق ان کے وسیع علم کی وجہ سے انھیں حاصل

ایک شخص کا معصوم ہونا کیسے ممکن ہے..... ۲۱۳

ہوئی ہیں۔ اعمال کے نتائج و انجام کا مشاہدہ کر لیتے ہیں اور ان نتائج سے جنہیں شریعت کی زبان میں عذاب کہا جاتا ہے، واقف و آگاہ رہتے ہیں، لہذا ہر طرح کے گناہ اور نافرمانی سے پرہیز کرتے ہیں۔ اسے سمجھنے کے لئے حسب ذیل عبارت پر غور کیجئے:

اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ خداوند عالم ہر طرح کے برے اور فتنج کام انجام دینے پر قادر ہے لیکن اس سے کبھی اس طرح کام صادر نہیں ہوتا جو اس کے عدل اور اس کی حکمت کے خلاف ہو اس کے باوجود ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ وہ ان کاموں کو انجام دینے کی قدرت نہیں رکھتا۔ بلکہ وہ ہر شے پر قادر ہے۔ معصوم افراد بھی گناہ کے سلسلہ میں یہی کیفیت رکھتے ہیں وہ لوگ بھی گناہ کرنے کی قدرت و توانائی رکھنے کے باوجود معصیت و گناہ کی طرف نہیں جاتے۔

چوبیسویں فصل

رہبران الہی کے لئے عصمت کی دلیلیں

علمائے عقائد نے الہی رہبروں خصوصاً انبیاء کرام کی عصمت کے بارے میں متعدد دلائل بیان کئے ہیں ہم یہاں ان میں سے دو دلیلیں بیان کرتے ہیں۔

یہ صحیح ہے کہ ان علماء نے یہ دلیلیں انبیاء کی عصمت کے لئے بیان کی ہیں لیکن یہی دلیلیں جس طرح انبیاء کی عصمت کو ثابت کرتی ہیں اسی طرح اماموں کی عصمت کو بھی ثابت کرتی ہیں۔ کیونکہ امامت شیعہ نقطہ نظر سے رسالت اور نبوت کا ہی تسلسل ہے۔ فرق یہ ہے کہ انبیاء منصب نبوت رکھتے ہیں اور ان کا رابطہ وحی الہی سے ہے اور امام کے یہاں یہ دو صفتیں نہیں ہیں۔ لیکن اگر ان دو خصوصیتوں سے صرف نظر کریں تو انبیاء اور اماموں کے درمیان کوئی خاص فرق نظر نہیں آتا۔

اب یہ دونوں دلیلیں ملاحظہ ہوں:

۱۔ تربیت عمل کے سہارے میں:

اس میں کوئی شک نہیں کہ انبیاء کرام کی بعثت کا مقصد انسانوں کی تربیت اور ان کی راہنمائی ہے اور تربیت کے مؤثر اسباب میں سے ایک سبب یہ بھی ہے کہ مربی میں ایسے صفات پائے جائیں جن کی وجہ سے لوگ اس سے قریب ہو جائیں۔ مثال کی طور پر اگر کوئی مربی خوش گفتار، فصیح اور نپتی تلی بات کرنے والا ہو لیکن بعض ایسے نفرت انگیز صفات اس میں پائے جائیں جس کے

سب لوگ اس سے دور ہو جائیں تو ایسی صورت میں انبیاء کی بعثت کا مقصد ہی پورا نہیں ہوگا۔ ایک مربی و رہبر سے لوگوں کی دوری اور نفرت کا سب سے بڑا سبب یہ ہے کہ اس کے قول و فعل میں تضاد اور دورگی پائی جاتی ہو۔ اس صورت میں نہ صرف اس کی راہنمائیاں بے قدر اور بیکار ہو جائیں گی بلکہ اس کی نبوت کی اساس و بنیاد ہی متزلزل ہو جائے گی۔

شیعوں کے مشہور اور بزرگ عالم سید مرتضیٰ علم الہدی نے اس دلیل کو یوں بیان کیا ہے: اگر ہم کسی کے فعل کے بارہ میں اطمینان نہیں رکھتے یعنی اگر ہمیں یہ شبہ ہے کہ وہ کوئی گناہ انجام دیتا ہے تو ہم اطمینان قلب کے ساتھ اس کی بات پر دھیان نہیں دیتے۔ اور ایسے شخص کی باتیں ہم پر اثر نہیں کر سکتیں جس کے بارے میں ہم جانتے ہیں کہ وہ خود اپنی بات پر عمل نہیں کرتا۔ جس طرح مربی یا رہبر کا گناہ کرنا لوگوں کی نظر میں اسے کم عقل، بے حیا اور لا ابا لی ثابت کرتا ہے اور لوگوں کو اس سے دور کر دیتا ہے اسی طرح مربی یا رہبر کے قول و فعل کی دورگی بھی لوگوں پر اس کے خلاف منفی اثر ڈالتی ہے۔

اگر کوئی ڈاکٹر شراب کے نقصانات پر کتاب لکھے یا کوئی متاثر کرنے والی فلم دکھائے لیکن خود لوگوں کے مجمع میں اس قدر شراب پئے کہ اپنے پیروں پر کھڑا نہ ہو سکے۔ ایسی صورت میں شراب کے خلاف اس کی تمام تقریریں، تقریریں اور زحماتیں خاک میں مل جائیں گی۔

فرض کیجئے کہ کسی گروہ کا رہبر کرسی پر بیٹھ کر عدل و انصاف اور مساوات کی خوبیاں بیان کرنے کے لئے زبردست تقریر کرے لیکن خود عملی طور سے لوگوں کا مال ہڑپ کرتا رہے تو اس کا عمل اس کی کبھی ہوئی باتوں کو بے اثر بنا دے گا۔

خداوند عالم اسی وجہ سے انبیاء کو ایسا علم و ایمان اور صبر و حوصلہ عطا کرتا ہے تاکہ وہ تمام گناہوں سے خود کو محفوظ رکھیں۔

اس بیان کی روشنی میں انبیاء الہی کے لئے ضروری ہے کہ وہ بعثت کے بعد یا بعثت سے

پہلے اپنی پوری زندگی میں گناہوں اور غلطیوں سے دور رہیں اور ان کا دامن کسی بھی طرح کی قول و فعل کی کمزوری سے پاک اور نیک صفات سے درخشاں رہنا چاہئے۔ کیونکہ اگر کسی شخص نے اپنی عمر کا تھوڑا سا حصہ بھی لوگوں کے درمیان گناہ اور معصیت کے ساتھ گزارا ہو اور اس کی زندگی کا نامہ اعمال سیاہ اور کمزوریوں سے بھرا ہو تو ایسا شخص بعد میں لوگوں کے دلوں میں گھر نہیں کر سکتا اور لوگوں کو اپنے اقوال و کردار سے متاثر نہیں کر سکتا۔

خداوند عالم کی حکمت کا تقاضا ہے کہ وہ اپنے نبی و رسول میں ایسے اسباب و صفات پیدا کرے کہ وہ ہر دل عزیز بن جائیں۔ اور ایسے اسباب سے انھیں دور رکھے جن سے لوگوں کے نبی یا رسول سے دور ہونے کا خدشہ ہو۔ ظاہر ہے کہ انسان کے گزشتہ برے اعمال اور اس کا تاریک ماضی لوگوں میں اس کے نفوذ اور اس کی ہر دعویٰ کی کو انتہائی کم کر دے گا اور لوگ یہ کہیں گے کہ کل تک تو وہ خود بد عمل تھا، آج ہمیں ہدایت کرنے چلا ہے!؟

۲۔ اعتماد جذب کرنا:

تعلیم و تربیت کے شرائط میں سے ایک شرط، جو انبیاء یا الہی رہبروں کے اہم مقاصد میں سے ہے، یہ ہے کہ انسان اپنے مربی کی بات کی سچائی پر ایمان رکھتا ہو کیونکہ کسی چیز کی طرف ایک انسان کی کشش اسی قدر ہوتی ہے جس قدر وہ اس چیز پر اعتماد و ایمان رکھتا ہے۔ ایک اقتصادی یا صحیح پروگرام کا پر جوش استقبال عوام اسی وقت کرتے ہیں جب کوئی اعلیٰ علمی کمیٹی اس کی تائید کر دیتی ہے۔ کیونکہ بہت سے ماہروں کے اجتماعی نظریہ میں خطا یا غلطی کا امکان بہت کم پایا جاتا ہے۔ اب اگر مذہبی پیشواؤں کے بارے میں یہ امکان ہو کہ وہ گناہ کرتے ہوں گے تو قطعی طور سے جھوٹ یا حقائق کی تحریف کا امکان بھی پایا جاتا ہوگا۔ اس امکان کی وجہ سے ان کی باتوں سے ہمارا اطمینان اٹھ جائے گا۔ اسی طرح انبیاء کا مقصد جو انسانوں کی تربیت اور ہدایت ہے ہاتھ نہ آئے گا۔

ممکن ہے یہ کہا جائے کہ اعتماد و اطمینان حاصل کرنے کے لئے یہ کافی ہے کہ دینی پیشوا

جھوٹ نہ بولیں اور اس گناہ کے قریب نہ جائیں تاکہ انھیں لوگوں کا اعتماد حاصل ہو۔ بقیہ سارے گناہوں سے ان کا پرہیز کرنا لازم نہیں ہے کیونکہ دوسرے گناہوں کے کرنے یا نہ کرنے سے مسئلہ اعتماد و اطمینان پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔

جواب یہ ہے کہ اس بات کی حقیقت ظاہر ہے، کیونکہ یہ کیسے ممکن ہے کہ ایک شخص جھوٹ بولنے پر آمادہ نہ ہو لیکن دوسرے گناہوں مثلاً آدم کشی، خیانت اور بے عفتی و بے حیائی کے اعمال کرنے میں اسے کوئی باک نہ ہو؟ اصولاً جو شخص دنیا کی لحاظی لذتوں کے حصول کے لئے ہر طرح کے گناہ انجام دینے پر آمادہ ہو وہ ان کے حصول کے لئے جھوٹ کیسے نہیں بول سکتا!؟

اصولی طور سے انسان کو گناہ سے روکنے والی طاقت ایک باطنی قوت یعنی خوف خدا اور نفس پر قابو پانا ہے۔ جس کے ذریعہ انسان گناہوں سے دور رہتا ہے۔ پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ جھوٹ کے سلسلہ میں تو یہ قوت کام کرے لیکن دوسرے گناہوں کے سلسلہ میں جو عموماً بہت برے اور وجدان و ضمیر کی نظر میں جھوٹ سے بھی زیادہ قبیح ہوں، یہ قوت کام نہ کرے!؟

اور اگر ہم اس جدائی کو ثبوت کے طور پر قبول کر بھی لیں تو اثبات کے طور سے یعنی عملاً عوام اسے قبول نہیں کریں گے۔ کیونکہ لوگ اس طرح کی جدائی کو ہرگز تسلیم نہیں کرتے۔

اس کے علاوہ گناہ جس طرح گناہ گار کو لوگوں کی نظر میں قابل نفرت بنا دیتے ہیں اسی طرح لوگ اس کی باتوں پر بھی اعتماد و اطمینان نہیں رکھتے اور ”انظر الیٰ ما قال ولا تنظر من الیٰ“ قال ”یعنی یہ دیکھو کیا کہہ رہا ہے یہ نہ دیکھو کون کہہ رہا ہے کالفلسفہ فقط ان لوگوں کے لئے مؤثر ہے جو

۱۔ اس کے علاوہ گناہ کرنے والے اگر جھوٹ نہ بولیں گے تو اس کا لازمہ یہ ہوگا کہ وہ سچائی کے ساتھ اپنے گناہوں کا اعتراف کریں اور جب لوگ ان کی برائیوں سے آگاہ ہو جائیں گے تو فطری طور سے ان کا وقار اور ان کی عزت خاک میں مل جائے گی اور لوگ ان سے نفرت کرنے لگیں گے۔ نتیجہ میں وہ بارہوی مشکل پیش آئے گی کہ مرئی اپنے عملی گناہ کے سبب لوگوں میں اپنی عزت گنوا دے گا۔

شخصیت اور اس کی بات کے درمیان فرق کرنا چاہتے ہیں لیکن ان لوگوں کے لئے جو بات کی قدر قیمت کو کہنے والے کی شخصیت اور اس کی طہارت و تقدس کے آئینہ میں دیکھتے ہیں یہ فلسفہ کارگر نہیں ہوتا۔

یہ بیان جس طرح رہبری و قیادت کے منصب پر آنے کے بعد صاحب منصب کے لئے عصمت کو ضروری جانتا ہے، اسی طرح صاحب منصب ہونے سے پہلے اس کے لئے عصمت کو لازم و ضروری سمجھتا ہے۔ کیونکہ جو شخص ایک عرصہ تک گناہ گار و لاابالی رہا ہو اور اس نے ایک عمر جرائم و خیانت اور فحشا و فساد میں گزاری ہو، چاہے وہ بعد میں توبہ بھی کر لے، اس کی روح میں روجی و معنوی انقلاب بھی پیدا ہو جائے اور وہ متقی و پرہیزگار اور نیک انسان بھی ہو جائے لیکن چونکہ لوگوں کے ذہنوں میں اس کے برے اعمال کی یادیں محفوظ ہیں لہذا لوگ اس کی نیکی کی طرف دعوت کو بھی بد بینی کی نگاہ سے دیکھیں گے اور بسا اوقات یہ تصور بھی کر سکتے ہیں کہ یہ سب اس کی ریاکاریاں ہیں وہ اس راہ سے لوگوں کو فریب دینا اور شکار کرنا چاہتا ہے۔ اور یہ ذہنی کیفیت خاص طور سے تعبدی مسائل میں جہاں عقلی استدلال اور تجزیہ کی گنجائش نہیں ہوتی، زیادہ شدت سے ظاہر ہوتی ہے۔

مختصر یہ کہ شریعت کے تمام اصول و فروع کی بنیاد استدلال و تجربہ پر نہیں ہوتی کہ الہی رہبر ایک فلسفی یا ایک معلم کی طرح سے اس راہ کو اختیار کرے اور اپنی بات استدلال کے ذریعہ ثابت کرے، بلکہ شریعت کی بنیاد وحی الہی اور ایسی تعلیمات پر ہے کہ انسان صدیوں کے بعد اس کے اسرار و غلغلے سے آگاہ ہوتا ہے اور اس طرح کی تعلیمات کو قبول کرنے کے لئے شرط یہ ہے کہ لوگ الہی رہبر کے اوپر سونی صدی اعتماد کرتے ہوں کہ جو کچھ وہ سن رہے ہیں اسے وحی الہی اور عین حقیقت تصور کریں، اور ظاہر ہے کہ یہ حالت ایسے رہبر کے سلسلے میں لوگوں کے دلوں میں ہرگز پیدا نہیں ہو سکتی جس کی زندگی ابتدا سے انتہا تک روشن و درخشاں اور پاک و پاکیزہ نہ ہو۔

یہ دو دلیلیں نہ صرف انبیائے کرام کے لئے عصمت کی ضرورت کو ثابت کرتی ہیں، بلکہ یہ

بھی ثابت کرتی ہیں کہ انبیاء کے جانشینوں کو بھی انبیاء کی طرح معصوم ہونا چاہئے، کیوں کہ امامت کا منصب اہل سنت کے نظریہ کے برخلاف کوئی حکومتی اور معمولی منصب نہیں ہے بلکہ جیسا کہ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں امامت کا منصب ایک الہی منصب ہے اور امام پیغمبر کے ساتھ (نبوت اور وحی کے علاوہ) تمام منصبوں میں شریک ہے۔ امام، دین کا محافظ و نگہبان اور قرآن کے مجمل مطالب کی تشریح کرنے والا ہے نیز ایسے بہت سے احکام کو بیان کرنے والا ہے جنہیں پیغمبر اکرم ﷺ بیان کرنے میں کامیاب نہیں ہوئے تھے۔

اس لئے امام مسلمانوں کا حاکم اور ان کی جان و مال و ناموس کا نگہبان بھی ہے اور شریعت کو بیان کرنے والا اور الہی معلم و مربی بھی ہے اور ایک مربی کو معصوم ہونا چاہئے، کیوں کہ اگر اس سے کوئی بھی چھوٹا یا بڑا گناہ سرزد ہوا تو اس کی تربیت بے اثر ہو جائے گی۔ اور اس کی گفتار و کردار کی صحت و درستگی پر سے لوگوں کا اعتماد اٹھ جائے گا۔

۱۔ لوگوں کا اعتماد جذب کرنے کا لازمہ یہ ہے کہ پیغمبر اپنی زندگی کے تمام احوال میں چاہے وہ رہبری سے پہلے کی زندگی ہو یا اس کے بعد وہی زندگی ہر طرح کے گناہ غرض اور اوڈی سے پاک و پاکیزہ ہو۔ کیوں کہ یہ بے دھڑک اور سو فی صدی اعتماد اسی وقت ممکن ہے جب اس شخص سے کبھی کوئی گناہ ہوتے ہوئے نہ دیکھا جائے۔ جو لوگ اپنی زندگی کا کچھ حصہ گناہ اور اوڈی میں بسر کرتے ہیں، اسکے بعد تو یہ کرتے ہیں، ممکن ہے کہ ایک حد تک لوگوں کا اعتماد جذب کر لیں لیکن سو فی صدی اعتماد تو بہر حال جذب نہیں کر سکتے۔

ساتھ ہی اس بات سے یہ نتیجہ بھی حاصل کیا جا سکتا ہے کہ رہبروں کو عمدی گناہ کے ساتھ ساتھ کبھو اور بھول سے کئے گئے گناہ سے بھی محفوظ ہونا چاہئے، کیوں کہ عمدی گناہ اعتماد کو سلب کر لیتا ہے اور سبھی گناہ اگرچہ بعض موارد میں اعتماد سلب کرنے کا باعث نہیں ہوتا لیکن انسان کی شخصیت کو ناقابل تلافی نقصان پہنچاتا اور اس کی شخصیت کو بری طرح مجروح کر دیتا ہے اگرچہ کوئی گناہ کی سزا نہیں ہے اور انسان، دین و عقل کی نگاہ سے معذور سمجھا جاتا ہے لیکن رائے عامہ پر اس کا برا اثر پڑتا ہے اور لوگ ایسے شخص سے دور ہو جاتے یا میں خاص طور سے اگر گناہ بھول سے کسی کو قتل کرنے کا یا ایسی جیسا ہو۔

پچیسویں فصل

جن کے رتبے ہیں سوا ان کو سوا.....

یہ طے ہے کہ اہم اور بڑی ذمہ داریوں کی انجام دہی کے لئے حالات و شرائط بھی سنگین ہوتے ہیں۔ ذمہ داری جتنی بڑی اور جتنی سنگین ہوتی ہے، شرائط بھی اسی لحاظ سے سنگین اور سخت ہوتے ہیں۔ ایک امام جماعت کے شرائط عدالت کے اس قاضی کے برابر نہیں ہیں جس کے اختیار میں لوگوں کی جان و مال ہوتے ہیں۔

نبوت اور امامت عظیم ترین منصب ہے جو خدا کی طرف سے انسانوں کو عطا ہوا ہے، جو افراد اس منصب پر فائز ہوتے ہیں وہ خداوند عالم کی طرف سے لوگوں کی جان و مال و ناموس پر مکمل تسلط و اختیار رکھتے ہیں اور ان کا ارادہ لوگوں کی زندگی کے تمام پہلوؤں پر نافذ ہوتا ہے۔ قرآن مجید پیغمبر اکرمؐ کے بارے میں فرماتا ہے: "النبي اولى بالمؤمنين من انفسهم"۔ یعنی پیغمبرؐ باایمان لوگوں کی جانوں پر ان سے زیادہ حق رکھتا ہے۔

پیغمبر اسلام ﷺ نے حدیث غدیر کے خطبہ میں خود کو اور حضرت علیؑ علیہ السلام کو لوگوں کی

جانوں پر ان سے زیادہ اولیٰ اور صاحب اختیار بتایا۔ کیا یہ ممکن ہے کہ حکمت و تدبیر والا خدا ایسے عظیم اور اہم منصب کی باگدور ایک غیر معصوم شخص کے ہاتھ میں دیدے ”اللہ اعلم حیث یجعل رسالتہ“

قرآن کی راہنمائی

پیغمبر اکرم ﷺ اور صاحبان امر (اولی الامر) ۱۔ قرآن کے صاف حکم کے مطابق واجب الاطاعت ہیں اور جس طرح ہم خدا کے فرمان کی اطاعت کرتے ہیں یوں ہی ان کے حکم کی اطاعت بھی ہم پر واجب ہے چنانچہ ارشاد ہوتا ہے: ”اطیعوا اللہ و اطیعوا الرسول و اولی الامر منکم“ یعنی خدا کی اطاعت کرو، اس کے رسول کی اور صاحبان امر کی اطاعت کرو۔ ۲۔ یہ آیت بالکل واضح طور سے صاحبان امر کی بلا قید و شرط اطاعت کا حکم دیتی ہے۔ اگر یہ افراد سو فی صدی گناہ و خطا سے محفوظ ہوں گے جب ہی خداوند عالم کی طرف سے ان کی بلا قید و شرط اطاعت کا واجب کیا جانا صحیح ہوگا۔ کیوں کہ اگر ہم ان کی عصمت کو تسلیم کر لیں تو معصوم کی بے قید و شرط اطاعت پر کوئی اعتراض نہ ہوگا، لیکن اگر ہم یہ فرض کر لیں کہ (اولی الامر) یعنی صاحبان امر کا گروہ جن کی اطاعت ہم پر واجب کی گئی ہے۔ معصوم نہ ہوں بلکہ گناہ گار و خطا کار افراد ہوں تو ایسی صورت میں خداوند عالم یہ کیسے حکم دے گا کہ ہم ان لوگوں کی بلا قید و شرط پیروی کریں!؟

لہذا اگر ہم پیغمبر اکرم ﷺ کے جانشینوں کے لئے عصمت کو شرط نہ جانیں اور فرض کریں کہ کسی جانشین نے کسی مظلوم کے قتل یا کسی بے گناہ کا مال و جائیداد ضبط کئے جانے کا حکم دے دیا اور ہم جانتے ہوں کہ وہ شخص مظلوم یا بے گناہ تھا تو ایسی صورت میں ہمیں قرآن کے حکم کے مطابق اس جانشین کے فرمان پر موہو عمل کرنا ہوگا یعنی اس مظلوم کو قتل یا بے گناہ کا مال ضبط کرنا ہوگا۔

۱۔ یہ وہی صاحبان امر ہیں جو پیغمبر اکرم ﷺ کے بعد مسلمانوں کے امور کے ذمہ دار ہیں۔ یا کم از کم مصداق ”اولی الامر“ ہیں۔

لیکن اگر ہم یہ کہیں کہ قرآن کریم نے ”اولی الامر“ کی پیروی کو خدا اور رسول کی اطاعت کے ساتھ قرار دیا ہے اور ان تینوں اطاعتوں کو بلا قید و شرط شمار کیا ہے تو اس سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ ”اولی الامر“ رسول خدا ﷺ کی ہی طرح گناہ و خطا سے معصوم ہیں۔ لہذا اب ہم یہ کہیں گے کہ کبھی کوئی معصوم ”اولی الامر“ کسی مظلوم کے قتل یا کسی بے گناہ کا مال ضبط کرنے کا حکم نہیں دیتا۔

ایک سوال کا جواب:

ممکن ہے یہ کہا جائے کہ اولی الامر کی اطاعت اسی صورت میں واجب ہے جب وہ شریعت اور خدا و رسول کے صاف حکم کے مطابق عمل کرے۔ ورنہ دوسری صورت میں نہ صرف ان کی اطاعت واجب نہیں ہے بلکہ ان کی مخالفت کرنی چاہئے۔

اس سوال کا جواب واضح ہے۔ کیوں کہ یہ بات اسی وقت عملی ہے جب اول یہ کہ تمام لوگ الہی احکام اور فروع دین سے مکمل آگاہی رکھتے ہوں اور حرام و حلال کی تشخیص دے سکتے ہوں۔ دوسرے یہ کہ اس قدر جرأت و شجاعت رکھتے ہوں کہ حاکم کے قہر و غضب سے خوف زدہ نہ ہوں۔ جب ہی یہ ممکن ہے کہ وہ حاکم کا حکم شریعت سے مطابق ہونے کی صورت میں بجالائیں ورنہ دوسری صورت میں اس سے مقابلہ کے لئے اٹھ کھڑے ہوں۔ لیکن افسوس کہ عام طور سے لوگ الہی احکام سے پوری آگاہی نہیں رکھتے کہ ”اولی الامر“ کے فرمان کو تشخیص دے سکیں بلکہ لوگوں کی اکثریت اس بات کی توقع رکھتی ہے کہ ”اولی الامر“ کے ذریعہ الہی احکام سے آگاہ ہوں اسی طرح جو طاقت سب پر مسلط ہے اس کی مخالفت بھی کوئی آسان بات نہیں ہے اور ہر ایک اس کے انجام کو برداشت نہیں کر سکتا۔

اس کے علاوہ اگر قوم کو ایسے اختیارات حاصل ہو جائیں تو لوگوں کے دلوں میں سرکشی کا جذبہ پیدا ہوگا اور نظام درہم و برہم ہو جائے گا اور ہر شخص کسی نہ کسی بہانہ سے ”اولی الامر“ کی اطاعت سے انکار کرے گا اور قیادت کی مشینری میں خلل پیدا ہو جائے گا،

یہی وجہ ہے کہ اس آیت کریمہ کی روشنی میں یہ یقین کیا جاسکتا ہے کہ ”اولی الامر“ کا منصب ان لوگوں کے لئے ہے جن کی اطاعت بلا قید و شرط واجب کی گئی ہے اور یہ افراد معصوم شخصیتوں کے علاوہ کوئی اور نہیں ہیں جن کا دامن ہر طرح کے گناہ، خطا، یا لغزش سے پاک ہے۔

قرآن کی دوسری راہنمائی

قرآن کریم میں ایک دوسری آیت جو امامت سے متعلق گفتگو کرتی ہے پوری بلاغت کے ساتھ ظلم و ستم سے پرہیز کو امامت کے لئے شرط قرار دیتی ہے۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے:

﴿اذ ابتلیٰ ابراہیم ربہ بکلمات فاتمهن قال انی جاعلک

للناس اماماً قال و من ذریتی قال لا ینال عہدی الظالمین﴾

”یعنی جب ابراہیم کو ان کے پروردگار نے بعض امور کے لئے

آزمایا اور وہ تمام امتحانوں میں کامیاب ہوئے تو ان سے ارشاد ہوا کہ میں

نے تم کو لوگوں کا پیشوا و امام قرار دیا۔ (جناب ابراہیم نے) عرض کیا: میری

ذریت اور میری اولاد کو بھی یہ منصب نصیب ہوگا تو جواب ملا کہ میرا عہد ستم

گاروں تک نہیں پہنچے گا“۔

امامت، نبوت کے مانند الہی منصب ہے جو صرف صالح اور شائستہ افراد کو ہی ملتا ہے اس

آیت میں جناب ابراہیم نے خدا سے یہ تقاضا کیا کہ میری اولاد کے حصہ میں بھی یہ منصب آئے

لیکن فوراً خداوند عالم کا خطاب ہوا کہ ظالم و ستمگر افراد تک یہ منصب نہیں پہنچے گا۔

مسلم طور سے اس آیت میں ظالم سے مراد وہ افراد ہیں جو گناہوں سے آلودہ ہیں، کیوں کہ

ہر طرح کا گناہ اپنے آپ پر ایک ظلم اور خدا کی بارگاہ میں نافرمانی کی جسارت ہے۔ اب یہ دیکھنا

چاہئے کہ کون سے ظالم لوگ اس آیت کے حکم کے مطابق منصب قیادت و امامت سے محروم ہیں۔ اصولی طور سے جو شخصیتیں لوگوں کی پیشوائی اور حاکمیت کی باگدور سنبھالتی ہیں وہ چار ہی طرح کی ہوتی ہیں:

- ۱۔ یا وہ زندگی بھر ظالم رہے ہیں چاہے منصب حاصل کرنے سے پہلے یا اس کے بعد۔
- ۲۔ یا انہوں نے پوری عمر میں کبھی گناہ نہیں کیا۔
- ۳۔ حاکم ہونے سے پہلے ظالم و ستمگر تھے لیکن قیادت و پیشوائی حاصل کرنے کے بعد پاک صاف ہو گئے۔
- ۴۔ یہ تیسری قسم کے برعکس ہے یعنی حکومت ملتے ہی ظلم و ستم شروع کر دیا اس سے پہلے گناہ نہیں کرتے تھے۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ جناب ابراہیمؑ نے ان چار گروہوں میں سے کس کے لئے اس منصب کی آرزو کی تھی؟ یہ تو ہرگز سوچا نہیں جاسکتا کہ جناب ابراہیمؑ نے پہلے اور جو تھے گروہ کے لئے اس عظیم منصب کی آرزو کی ہوگی۔ کیونکہ جو لوگ حاکمیت کے دوران ظالم و ستمگر میں کسی بھی صاحب عقل اور صائب رائے رکھنے والے کی نظر میں اس منصب کے لائق نہیں ہوتے ہیں، چہ جائیکہ ابراہیمؑ خلیل کی نگاہ میں۔ جنہوں نے خود کتنے سنگین امتحانات دینے، ساری زندگی پاکیزگی کے ساتھ بسر کرنے اور گناہ و ظلم سے مسلسل لڑنے کے بعد یہ عظیم منصب حاصل کیا ہے وہ ہرگز مذکورہ دو گروہوں کے لئے تمام انسانوں پر امامت کی آرزو نہیں کر سکتے۔ ظاہر ہے کہ جناب ابراہیمؑ کا مقصود دوسری دو قسم کی شخصیتیں تھیں۔ اس صورت میں جملہ ”لایینال“ کی شرط کے ذریعہ تیسرا گروہ بھی نکل جاتا ہے اور منصب امامت کے لئے صرف وہی گروہ رہ جاتا ہے جس نے اپنی پوری زندگی میں کبھی کوئی گناہ نہیں کیا ہے۔

چھبیسویں فصل

کون سی تعبیر صحیح ہے

”عترتی“ یا ”سنٹی“

اگرچہ کتاب اپنے اختتام کو پہنچ چکی تھی لیکن یہاں دو موضوع پر گفتگو لازمی و ضروری ہے۔
۱۔ حدیث ثقلین سے متعلق گفتگو ہوتی ہے تو بعض اہل سنت لفظ ”عترتی“ کی جگہ
”سنٹی“ استعمال کرتے ہیں اور ”کتاب اللہ و سنتی“ کہتے ہیں۔

۲۔ اہل سنت حضرات پیغمبر اکرم پر درود بھیجتے وقت ان کی آل کو شامل نہیں کرتے۔
یہ دو موضوع شیعہ اور اہل سنت دونوں گروہوں کے درمیان اختلاف کا سبب ہیں لہذا
یہاں ان دونوں موضوعات کا جائزہ لیا جا رہا ہے۔

۱۔ کون سی تعبیر صحیح ہے:

امامیہ متکلمین جیسے صدوق، طوسی اور مفید رضوان اللہ علیہم نے بہت سے کلامی مسائل میں
پیغمبر اکرم ﷺ کی عترت و اہل بیٹ کی احادیث سے استدلال کیا ہے اور اس سلسلہ میں حدیث

ثقلین کا سہارا لیتے ہیں جب کہ بعض محدثوں نے مذکورہ حدیث کو دوسری شکل میں نقل کیا ہے اور لفظ ”عترتی“ کے بجائے ”نسنتی“ لائے ہیں۔ حدیث ثقلین کے متن میں اس اختلاف کے ہوتے ہوئے اس کے ذریعہ کلامی مسائل میں استدلال کیسے کیا جاسکتا ہے؟

وضاحت: امامیہ شیعہ جو اصول و عقائد میں برہان و عقلی دلیل کی پیروی کرتے ہیں، اہل بیت کے اقوال و احادیث کو بھی اگر صحیح نقل ہوئی ہوں تو اصول و فروع میں حجت جانتے ہیں۔ فرق یہ ہے کہ فروعی و عملی مسائل میں خبر صحیح کو مطلق طور سے حجت جانتے ہیں چاہے وہ خبر واحد کی صورت میں کیوں نہ ہو لیکن اصول و عقائد سے مربوط مسائل میں چونکہ مقصد اعتقاد و یقین پیدا کرنا ہے اور خبر واحد یقین کی حد تک نہیں پہنچاتی لہذا صرف اس قطعی خبر کو جس سے یقین و علم حاصل ہوتا ہو حجت شمار کرتے ہیں۔ اہل بیت کے اقوال کی حجت کی ایک دلیل حدیث ثقلین ہے جسے بہت سے اسلامی محدثوں نے قبول کیا ہے اور وہ کہتے ہیں کہ پیغمبر اکرمؐ نے ارشاد فرمایا ہے:

”انی تارک فیکم الثقلین کتاب اللہ و عترتی ما ان تمسکتہم

بہما لن تضلوا“

لیکن چونکہ بعض روایات میں ”عترتی“ کے بجائے ”نسنتی“ آیا ہے، اسی لئے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ان دو روایتوں میں سے کون صحیح و درست ہے؟ اس لئے کلامی مسائل میں اہل بیت کی احادیث کے ذریعہ استدلال پر سوالیہ نشان لگ گیا ہے؟ جس کے جواب میں علمائے شیعہ کی طرف سے رسالے اور کتابیں لکھی گئی ہیں جن میں سب سے اہم کتاب ”دار التقریب بین المذہب الاسلامیہ“ کی جانب سے قاہرہ مصر میں شائع ہو چکی ہے۔

ابھی کچھ عرصہ پہلے اردن کے ایک اہل سنت عالم ”شیخ حسن بن علی سقاف“ نے اس سوال کا جواب دیا ہے، ہم قارئین کرام کی خدمت میں اس کا ترجمہ پیش کرتے ہیں اور چونکہ ان کا جواب سو فیصدی تحقیقی ہے لہذا اسی پر اکتفا کرتے ہیں آخر میں ایک یاد دہانی شیخ سقاف کی خدمت میں بھی

کریں گے۔

سوال:

مجھ سے حدیث ثقلین کے بارے میں سوال کیا گیا اور دریافت کیا گیا ہے کہ ”عترتی و اہل بیٹی“ صحیح ہے یا ”کتاب اللہ و سنتی“ آپ سے درخواست ہے کہ سند کے اعتبار سے اس حدیث کی وضاحت فرمائیے۔

جواب:

اس متن کو دو بڑے محدثوں نے نقل کیا ہے:

۱۔ مسلم نے اپنی صحیح میں جناب زید بن ارقمؓ سے نقل کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ پیغمبر اسلامؐ نے ایک روز مکہ اور مدینہ کے درمیان ”وخم“ نام کی جگہ پر ایک خطبہ ارشاد فرمایا اور اس میں خدا کی حمد و ثنا اور لوگوں کو نصیحت فرمائی۔ اس کے بعد فرمایا:

”یا ایہا الناس! فانما انا بشر یوشک ان یاتی رسول ربی فاجیب وانا تارک فیکم ثقلین: اولہما کتاب اللہ فیہ الہدیٰ والنور، فخذوا بکتاب اللہ واستمسکوا بہ فحث علی کتاب اللہ ورغب فیہ ثم قال واهل بیٹی، اذکرکم اللہ فی اہل بیٹی، اذکرکم اللہ فی اہل بیٹی، اذکرکم اللہ فی اہل بیٹی“

اے لوگو! میں انسان ہوں ممکن ہے کہ عنقریب خدا کا فرستادہ میرے پاس آئے اور میں اس کی دعوت پر لبیک کہوں۔ میں تمہارے درمیان دو گرانقدر چیزیں چھوڑے جا رہا ہوں۔ ایک اللہ کی کتاب ہے، جس میں ہدایت و نور ہے۔ پس اللہ کی کتاب کو حاصل کرو اور اس سے تمسک اختیار کرو، پیغمبر اکرم ﷺ نے اللہ کی کتاب پر عمل کرنے کی تاکید کی اس کے بعد

فرمایا: اور میرے اہل بیت، میں تمہیں اپنے اہلبیت کے لئے خدا کی یاد دلاتا ہوں (یہ جملہ آپ نے تین بار فرمایا)

اس متن کو مسلم ۱ نے اپنی صحیح میں اور دارمی نے اپنی سنن ۲ میں ذکر کیا ہے اور دونوں کی سند آفتاب کی طرح روشن ہے ان سند میں ذرہ برابر بھی خدشہ نہیں ہے۔

۲۔ ترمذی نے بھی اس متن کو ”عترتی اہل بیتی“ کے الفاظ کے ساتھ نقل کیا ہے۔ حدیث کا متن یوں ہے:

”انی تارک فیکم ما ان تمسکتہم بہ لن تصلوا بعدی ، احدہما اعظم من الآخر کتاب اللہ حبل ممدود من السماء المی الارض و عترتی اہل بیتی لن یفترقا حتی یردا علی الحوض ، فانظر وا کیف تخلفونی فیہا“ ۳

”میں تمہارے درمیان دو چیزیں چھوڑے جا رہا ہوں، جب تک تم اس سے متمسک رہو گے ہرگز گمراہ نہیں ہو گے ان میں سے ایک دوسرے سے بزرگ ہے۔ اللہ کی کتاب ریسمانِ رحمت جو آسمان سے زمین کی طرف آویزاں ہے۔ اور میری عترت و اہل بیت۔ یہ دونوں ایک دوسرے سے ہرگز جدا نہیں ہوں گے یہاں تک کہ حوضِ کوثر پر میرے پاس آجائیں۔ اب دیکھو میری ان دونوں میراثوں کے ساتھ کیا سلوک کرتے ہو۔

یہ دونوں متن کہ دونوں میں لفظ ”اہل بیت“ کی تاکید ملتی ہے اس سلسلہ میں جواب کے طور پر کافی ہیں دونوں کی سندوں میں کمال یقین پایا جاتا ہے اور اس میں کسی بحث کی ضرورت نہیں ہے۔

۱۔ صحیح مسلم، ج ۲/۱۸۰، نمبر ۲۳۰۸، چاپ عبدالہادی

۲۔ سنن دارمی، ج ۲/۳۳۱-۳۳۲

۳۔ سنن ترمذی، ج ۵/۶۶۳، نمبر ۳۷۷۸۸

دونوں حدیثی متن کے ناقل صحاح و سنن ہیں جو ایک خاص اعتبار رکھتے ہیں۔

”و سننتی“ کے متن کی سند

وہ روایت جس میں ”اہل بیتی“ کے بجائے لفظ ”سننتی“ آیا ہے۔ جعلی حدیث ہے جو سند کے ضعف کے علاوہ امویوں سے وابستہ افراد کے ہوتھوں گڑھی ہوئی ہے۔ ذیل میں ہم اس حدیث کی اسناد کا جائزہ لیتے ہیں:

پہلی سند، حاکم کی روایت:

حاکم نیشاپوری نے اپنی ”مستدرک“ میں حسب ذیل سند کے ساتھ نقل کیا ہے:

۱۔ اسماعیل بن ابی اویس

۲۔ ابی اویس

۳۔ ثور بن زید الدیلیمی

۴۔ عکرمہ

۵۔ ابن عباس کہ پیغمبر اکرم ﷺ نے فرمایا:

”یا ایہا الناس انی قد ترکت فیکم ان اعتصمتم بہ فلن تصلوا

ابدا کتاب اللہ و سنة نبیہ“ ۱۔

اے لوگو! میں نے تمہارے درمیان دو چیزیں ترک کیں جب تک

تم ان دونوں سے وابستہ رہو گے ہرگز گمراہ نہ ہو گے۔ اللہ کی کتاب اور اس

کے نبی کی سنت۔

اس متن کی سند کی مشکل اسماعیل بن ابی اویس اور ابو اویس ہیں۔ ان باپ اور بیٹوں کی نہ صرف توثیق نہیں ہوئی ہے بلکہ ان پر جھوٹ اور حدیث گڑھنے کا الزام ہے۔ اب ان کے بارے میں علمائے رجال کی آراء ملاحظہ فرمائیں:

حافظ مزنی نے اپنی کتاب ”تہذیب الکمال“ میں اسماعیل اور اس کے باپ کے بارے میں رجال کے محققین کی زبانی یوں نقل کیا ہے:

یحییٰ بن معین (جو علم رجال کے بڑے عالم ہیں) کہتے ہیں۔ ابو اویس اور اس کا بیٹا ضعیف ہیں، یحییٰ بن معین سے یہ بھی نقل ہے کہ یہ دونوں حدیث چراتے ہیں۔ ابن معین نے اس کے بارے میں یہ بھی کہا ہے کہ: اس کی بات پر اعتماد نہیں کیا جاسکتا۔

نسائی نے بیٹے کے بارے میں کہا ہے کہ: وہ ضعیف ہے اور ثقہ نہیں ہے۔ ابو القاسم لاکائی نے کہا ہے کہ نسائی نے اس کے خلاف بہت کچھ کہا ہے۔ یہاں تک کہ اس نے کہا ہے: اس کی حدیث کو ترک کر دینا چاہئے۔

رجال کے ایک عالم ابن عدی نے کہا ہے: ابن ابی اویس نے اپنے ماموں مالک سے مجہول حدیثیں نقل کی ہیں جنہیں کوئی قبول نہیں کرتا۔ ۱۔

ابن حجر نے فتح الباری کے مقدمہ میں لکھا ہے: ابن ابی اویس کی حدیث کے ذریعہ ہرگز استدلال نہیں کیا جاسکتا۔ کیوں کہ نسائی نے اس کی مذمت کی ہے۔ ۲۔

حافظ سید احمد بن الصدیق نے کتاب ”فتح الملک العلّی“ میں سلمہ بن شیبہ سے نقل کیا ہے کہ اس نے اسماعیل بن ابی اویس کو کہتے ہوئے سنا ہے: جب اہل مدینہ کسی موضوع کے بارے میں دو گروہوں میں تقسیم ہو جاتے ہیں تو میں حدیث گڑھتا ہوں۔ ۳۔

۱۔ حافظ مزنی، تہذیب الکمال، ج ۳ ص ۱۲۷

۲۔ ابن حجر عسقلانی مقدمہ فتح الباری، ص ۳۹۱ طبع دار المعرفہ

۳۔ حافظ سید احمد، فتح الملک العلّی ص ۱۵۱

لہذا بیٹا (اسماعیل بن ابی اویس) وہ ہے جس پر حدیث گڑھنے کا الزام ہے اور ابن معین اسے جھوٹا کہتے ہیں مزید یہ کہ اس کی حدیث کسی بھی کتب صحاح میں نقل نہیں ہوئی ہے۔

اور باپ کے بارے میں یہی کہنا کافی ہے کہ ابو حاتم رازی نے کتاب ”جرح و تعدیل“ میں لکھا ہے: اس کی حدیث لکھی جاتی ہے لیکن اس کے ذریعہ احتجاج و استدلال نہیں کیا جاتا۔ اور اس کی حدیث قوی و محکم نہیں ہے۔

نیز ابو حاتم نے ابن معین سے نقل کیا ہے کہ ابو اویس قابل اعتماد نہیں ہے۔ جو روایت ابن دونوں کی سند کے ذریعہ بیان ہو ہرگز صحیح نہیں ہوگی۔ جب کہ یہ روایت صحیح و ثابت روایت کے مخالف و مقابل ہے۔

قابل توجہ نکتہ یہ ہے کہ حدیث کے ناقل یعنی حاکم نیشاپوری نے اس حدیث کے ضعیف ہونے کا اعتراف کیا ہے لہذا اس کی سند کی تصحیح نہیں کی ہے لیکن اس کے مفاد کی صحت پر گواہ لے آئے ہیں کہ وہ بھی سند کے اعتبار سے ست اور اعتبار کے درجہ سے ساقط ہے۔ اس لئے حدیث کی تقویت کے بجائے اس کے ضعف میں اضافہ ہی ہوا ہے۔

سننی کی دوسری سند

حاکم نیشاپوری نے ابو ہریرہ سے بطور مرفوع ۲ نقل کیا ہے:

”انّی قد ترکت فیکم شیئین لن تضلوا بعدہما: کتاب اللہ

وسنتی ولن یفترقا حتی یردا علیّ الحوض“ ۳

۱۔ ابو حاتم رازی، الجرح والتعدیل، ج ۵، ص ۹۲

۲۔ وہ حدیث جسے راوی معصوم سے نسبت نہ دے

۳۔ حاکم، مستدرک، ج ۱، ص ۹۳

اس متن کو حاکم نے اس سند کے ذریعہ نقل کیا ہے:

۱۔ الضبی، از

۲۔ صالح بن موسیٰ الطلحی، از

۳۔ عبد العزیز بن رفیع، از

۴۔ ابی صالح، از

۵۔ ابی ہریرہ۔

یہ حدیث پہلی حدیث کی طرح جعلی ہے۔ اور اس کی سند کے درمیان صالح بن موسیٰ الطلحی پر انگلی رکھی جاسکتی ہے۔ اب ہم اس کے بارے میں علمائے علم رجال کے نظریات نقل کرتے ہیں:

یحییٰ بن معین کا بیان ہے کہ صالح بن موسیٰ قابل اعتماد نہیں ہے۔ ابو حاتم رازی کا قول ہے کہ اس کی حدیث ضعیف اور منکر ہے۔ وہ بہت سی منکر حدیثوں کو ثقہ افراد کے نام سے نقل کرتا ہے۔ نسائی کا بیان ہے کہ اس کی حدیث لکھی نہیں جاتی اور دوسری جگہ کہتے ہیں: اس کی حدیث متروک ہے۔ ۱

ابن حجر "تہذیب التہذیب" میں لکھتے ہیں کہ ابن حبان نے کہا ہے: صالح بن موسیٰ، ثقہ افراد سے ایسی چیزیں منسوب کرتا ہے جو ان کی باتیں نہیں لگتیں۔ اور آخر میں ابن حجر نے لکھا ہے کہ: اس کی حدیث حجت نہیں ہے، اور ابو نعیم کہتے ہیں کہ: اس کی حدیث متروک ہے وہ ہمیشہ منکر حدیث نقل کرتا ہے۔ ۲

ایک دوسری جگہ ابن حجر کتاب تقریب ۳ میں لکھتے ہیں: اس کی حدیث متروک ہے اور

۱۔ حافظ مزنی، تہذیب التہذیب، المکمل، ج ۱۳، ص ۹۶

۲۔ تہذیب التہذیب، ابن حجر، ج ۴، ص ۳۵۵

۳۔ تقریب، ابن حجر، ترجمہ نمبر ۲۸۹۱

ذہبی، کتاب ”کاشف“ ۱ میں لکھتے ہیں: اس کی حدیث سست ہے۔ آخر میں ذہبی نے ”میزان الاعتدال“ ۲ میں مذکورہ بالا حدیث کو نقل کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اس کی حدیثیں منکر ہوتی ہیں۔
حدیث ”وستی“ کی تیسری سند:

ابن عبدالبر نے کتاب ”تمہید“ ۳ میں اس متن کو حسب ذیل سند کے ساتھ ذکر کیا ہے:

۱۔ عبدالرحمان بن یحییٰ۔ از

۲۔ احمد بن سعید۔ از

۳۔ محمد بن ابراہیم الدیلمی۔ از

۴۔ علی بن زید القرائسی۔ از

۵۔ الحنفی۔ از

۶۔ کثیر بن عبداللہ بن عمرو بن عوف۔ از

۷۔ اس کے باپ نے اس کے دادا سے

ہم ان راویوں کے درمیان کثیر بن عبداللہ پر انگلی رکھتے ہیں۔ امام شافعی لکھتے ہیں: وہ

جھوٹ کے ارکان میں سے ایک ہے۔ ۴ ابو داؤد کا بیان ہے: وہ کذابوں اور بڑے جھوٹوں میں

سے ہے ۵ ابن حبان کہتے ہیں: عبداللہ بن کثیر نے اپنے باپ اور دادا سے حدیث کی کتاب نقل

کی ہے جس کی بنیاد جعلی حدیثوں پر ہے کہ اس کتاب سے نقل کرنا اور عبداللہ سے روایت کرنا حرام

ہے اور فقط تعجب و تنقید کے لئے اس کی روایت نقل کی جا سکتی ہے۔ ۶

۲۔ کاشف، ذہبی، ج ۱، نمبر ۳۱۲

۵۔ میزان الاعتدال، ذہبی، ج ۲، ص ۳۰۲

۳۔ تمہید، ج ۲، ص ۳۳۱

۴۔ ۵۔ حمزہ بن ابی حمزہ، ج ۱، ص ۳۷۷، طبع دار الفکر، حمزہ بن ابی حمزہ، ج ۱، ص ۳۳۸

۶۔ البحر و بحین از ابن حبان، ج ۲، ص ۳۳۱

نسائی اور دارقطنی کہتے ہیں: اس کی حدیث متروک ہے۔ امام احمد بن حنبل کہتے ہیں کہ: وہ منکر الحدیث ہے اور قابل اعتماد نہیں ہے۔ ابن معین نے بھی یہی بات اس کے بارے میں کہی ہے۔ ابن حجر کے اوپر تعجب ہے کہ انہوں نے کتاب ”التقریب“ میں اس کے حالات بیان کرتے ہوئے اسے صرف ضعیف لکھا ہے اور جن لوگوں نے اسے جھوٹا کہا ہے انہیں افراطی کہا ہے، جبکہ علم رجال کے پیشواؤں نے اسے جھوٹا اور جعل ساز قرار دیا ہے یہاں تک کہ ذہبی کہتے ہیں کہ: اس کی باتیں فضول و ضعیف و بیکار ہیں۔

بغیر سند کی روایت

امام مالک نے کتاب ”الموطأ“ میں اس روایت کو سند کے بغیر بطور مرسل نقل کیا ہے۔ اور سب جانتے ہیں کہ ایسی حدیث کوئی اہمیت نہیں رکھتی۔ ۱

مذکورہ بالا باتیں پوری طرح سے یہ بات ثابت کرتی ہیں کہ ”وسنی“ والی حدیث جھوٹے اور اموی دربار سے وابستہ راویوں کی جعلی اور گڑھی ہوئی حدیث ہے جو انہوں نے حدیث صحیح کے مقابلہ میں گڑھی ہے۔ لہذا مسجدوں کے اماموں، خطیبوں اور اہل منبر حضرات پر واجب ہے کہ جو حدیث حضرت رسول اکرمؐ سے وارد نہیں ہوئی ہے اسے ترک کر دیں اور اس کے بجائے لوگوں کو صحیح حدیث سے آگاہ کریں۔ جس حدیث کو مسلم نے ”اہل بیتی“ کے ساتھ اور ترمذی نے ”عترتی و اہل بیتی“ کے ساتھ نقل کیا ہے اسے بیان کریں۔ طالب علموں پر لازم ہے کہ علم حدیث کی طرف توجہ کریں اور صحیح و ضعیف حدیث میں فرق کو سمجھیں۔

آخر میں، میں یہ یاد دہانی کرانا چاہتا ہوں کہ لفظ ”اہل بیتی“ میں پیغمبر اکرم ﷺ کی ذریت مثلاً حضرت فاطمہ و حسن و حسین علیہم السلام بھی داخل ہیں، کیونکہ مسلم نے اپنی صحیح ۲

۱۔ الموطأ، امام مالک، ص ۸۸۹، حدیث نمبر ۳

۲۔ صحیح مسلم، ج ۲، ص ۱۸۸۳، نمبر ۲۳۲۳

میں اور ترمذی نے اپنی سنن! میں خود ام المومنین عائشہ سے نقل کیا ہے کہ:

”نزلت هذه الآية على النبي ﷺ ”انما يريد الله ليذهب عنكم الرجس اهل البيت ويطهركم تطهيرا“ في بيت ام سلمة، فذهب فجله فاطمة وحسناً وحسيناً فجلهم بكساء وعلى خلف ظهره فجله بكساء ثم قال: اللهم هؤلاء اهل بيتي فاذهب عنهم الرجس وطهرهم تطهيرا، قالت ام سلمة وانا معهم يا نبي الله؟ قال انت على مكانك وانت الى الخير“

آیت ”انما يريد الله ليذهب عنكم الرجس اهل البيت ويطهركم تطهيرا“ جناب ام سلمہ کے گھر میں نازل ہوئی پیغمبر اکرم ﷺ نے فاطمہ، حسن و حسین علیہم السلام کو کساء کے نیچے لے لیا۔ حضرت علی آپ کی پشت پر کھڑے تھے آنحضرت نے ان پر بھی اپنی عبا اڑھائی اور فرمایا: پالنے والے! یہ میرے اہل بیت ہیں ان سے ہر طرح کی برائیوں کو دور فرما اور انھیں ایسا پاک قرار دے جو پاک کرنے کا حق ہے۔ اس وقت جناب ام سلمہ نے کہا: اے رسول خدا ﷺ کیا میں بھی ان میں سے ہوں؟ پیغمبر ﷺ نے فرمایا: تم اپنی جگہ پر رہو (یعنی چادر کے نیچے نہ آؤ) تم راہ خیر پر ہو۔ ۱

یہ تو تھا اہل سنت کے عالم و دین شیخ حسن بن علی سقاف کا برادران اہل سنت کو جواب۔ لیکن یہاں خود شیخ سقاف کے بیان کردہ ایک مسئلہ کو صاف کرنا چاہتا ہوں۔ انھوں نے آیت تطہیر میں ازواج پیغمبر اکرم ﷺ کے شامل ہونے کو تو مسلم بتایا ہے اور آیت کے مفاد کو وسیع کر کے اس میں

پیغمبر اکرم ﷺ کی بیٹی اور ان کے دو صاحب زادوں کو شامل کرنے کی کوشش کی ہے۔ جب کہ خود جناب ام سلمہ کی روایت جسے صحیح مسلم اور سنن ترمذی نے نقل کیا ہے ان کے نظریہ کے خلاف گواہی دے رہی ہے۔ اگر اہل بیت کے علاوہ ازواج پیغمبر اکرم ﷺ آیت تطہیر میں داخل ہوتیں تو جناب ام سلمہ کو کساء میں داخل ہونے سے روکا نہ جاتا اور یہ نہ کہا جاتا ”انت علی مکانک“ یعنی تم اپنی جگہ پر رہو۔ اور تم خیر پر ہو!!

اس کے علاوہ جو شخص بھی ازواج پیغمبر ﷺ کے سلسلہ میں قرآن کی آیات کا مطالعہ کرے گا اسے واضح طور سے یہ بات معلوم ہو جائے گی کہ ان کے بارے میں آیات کی زبان تنبیہ و شہرت والی ہے۔ ایسے افراد آیت تطہیر کے مصداق اور رسول خدا ﷺ کی دعا میں شامل نہیں ہو سکتے۔ اس کی تفصیل ”تفسیر منشور جاوید“ ۱ میں ملاحظہ فرمائیں۔

۲۔ پیغمبر پر صلوات کیسے بھیجیں

شیعہ اور اہل سنت کے درمیان اختلافی مسائل میں سے ایک مسئلہ یہ بھی ہے کہ وہ جب پیغمبر پر صلوات بھیجتے ہیں تو اس میں ان کی آل کو شامل نہیں کرتے اور وہ ”صلی اللہ علیہ وسلم“ کہتے ہیں۔ جب کہ شیعہ پیغمبر اکرم ﷺ پر صلوات بھیجتے وقت ان کی آل کو بھی شامل کرتے ہیں اور آل کو ان پر عطف کرتے ہوئے کہتے ہیں ”صلی اللہ علیہ وآلہ“۔ اب سوال یہ ہے کہ ان دو صورتوں میں سے کون سی صورت صحیح ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ ہمارے معصوم رہبروں یعنی ائمہ علیہم السلام نے دوسری صورت کو صحیح جانا ہے اور ہمیشہ آنحضرت کے ساتھ ان کی آل کو بھی شامل کرتے ہیں۔ اب ذرا دیکھیں کہ اہل سنت کی روایات میں صلوات کی کیفیت کیا ہے۔ اور ان کی روایتیں ان دونوں صورتوں میں سے کس کی

تصدیق کرتی ہیں۔

پہلے ہم اس سوال کا مختصر جواب دے چکے ہیں اب یہاں روایت نقل کرتے ہیں:

”جب آیت ﴿إِن اللّٰهَ وَمَلَائِكَتَهُ يَصلُّونَ عَلٰى النَّبِيِّ يَا أَيُّهَا الَّذِینَ آمَنُوا صَلُّوا عَلَیْهِ وَسَلِّمُوا تَسْلِیْمًا﴾ سورة احزاب ۵۶، نازل ہوئی تو اصحاب نے آنحضرتؐ سے دریافت کیا کہ آپ پر کس طرح صلوات بھیجیں؟ آنحضرتؐ نے فرمایا: ”لا تصلوا علی الصلاة البتراء“ مجھ پر ناقص صلوات مت بھیجو۔ لوگوں نے پوچھا کیسے بھیجیں؟ فرمایا: کہو (اللّٰهُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَآلِ مُحَمَّدٍ)۔

دروود بھیجنے کے اعتبار سے آل محمدؐ کی حیثیت ایسی ہے کہ اہل سنت کے بعض فقہی مذاہب آل محمدؐ پر پیغمبرؐ کے ساتھ صلوات بھیجنے کو لازم و واجب جانتے ہیں۔ امام شافعی اس سلسلہ میں فرماتے ہیں:

یا اهل بیت رسول الله حکیم فرض من الله فی القرآن انزله
کفاکم فی عظیم القدر انکم من لم یصل علیکم لاصلاة له ۲

اے رسول خدا کے اہل بیت آپ کی محبت ایسا فریضہ ہے جو قرآن میں نازل کیا گیا ہے آپ کی عظمت و جلالت کیلئے اتنا ہی کافی ہے کہ جو شخص آپ پر صلوات نہ بھیجے اس کی نماز ہی نہیں ہے۔

۱۔ صواعق محرقة، چاپ دوم مکتبہ ”القاهرة“ مصر باب ۱۱ فصل اول ص ۱۳۶
ایسی ہی روایت سیوطی کی کتاب ”الدر المنثور“ ج ۵ سورہ احزاب کی آیت نمبر ۵۶ کے ذیل میں وارد ہوئی ہے جسے سیوطی نے ”المعصن“ کے مؤلف عبدالرزاق ابن ابی شیبہ، احمد بن حنبل، امام بخاری و مسلم، ابو داؤد و ترمذی، نسائی، ابن ماجہ اور ابن مردودہ سے نقل کیا ہے۔

شعری ترجمہ

اے اہل بیت آپ کی الفت خدا گواہ ہے فرض ہر بشر پہ خدا کی کتاب میں
رفعت یہ ہے کہ جو نہ پڑھے آپ پر درود اس کی نماز ہی نہیں حق کی جناب میں
(ازترجم)

صحیح بخاری اہل سنت کے نزدیک قرآن مجید کے بعد سب سے معتبر اور صحیح کتاب مانی جاتی ہے۔ اب ہم سورہ احزاب کی تفسیر کے ذیل میں صحیح بخاری کی ایک حدیث کی طرف قارئین کی توجہ مبذول کرتے ہیں:

عبدالرحمان ابن ابی لیلیٰ نقل کرتے ہیں کہ: کعب بن عجرہ نے مجھ سے ملاقات کی اور کہا: کیا تم پسند کرتے ہو کہ میں ایک حدیث تمہیں تحفہ کے طور پر پیش کروں، وہ حدیث یہ ہے کہ ایک روز پیغمبر اکرمؐ اپنے اصحاب کے پاس تشریف لائے۔ ہم نے عرض کی: یا رسول خدا! ہم نے آپ پر سلام کرنے کی کیفیت قرآن سے سیکھی اب بتائیے کہ آپ پر صلوات کیسے بھیجیں؟ آنحضرتؐ نے فرمایا: ”اللّٰهُم صل علی محمد و آل محمد کما صلیت علی ابراہیم و آل ابراہیم انک حمید مجید“

لہذا اسلامی ادب اور پیغمبر اسلامؐ کے حکم کی تعمیل کا تقاضا ہے کہ ہم آنحضرتؐ پر ناقص اور دم بریدہ صلوات نہ بھیجیں نیز آنحضرتؐ اور ان کی آل پاکؑ میں جدائی نہ پیدا کریں۔

تمام شد

بحمد اللہ والمنۃ و صلی اللہ علی سیدنا محمد و آلہ الطاہرین خیر الامۃ

۱۱ ربیع الثانی ۱۴۲۳ھ بروز میلاد حضرت امام رضاؑ

Ummat Ki Rahbari

Ayatullah Jafar Subhani

امت کی رہبری

تالیف: آیت اللہ جعفر سبحانی



www.ahli-ul-bait.org

www.ahli-ul-bait.org

ISBN 964-8686-87-1



9 789648 686871